

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222219

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵۴۳۳۲ Accession No. ۱۵۱۴۲
Author ارماند ساگر ر - ج
Title جو رہاٹا

This book should be returned on or before the date
last marked below.

جوارجھاٹ

جوار بھاٹا

افسانے

رامانند سنگر

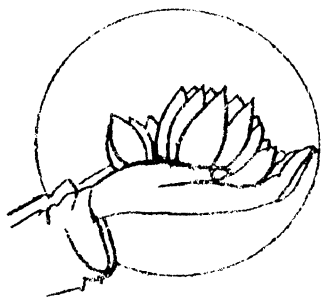
ناشران

یونیورسٹی لائبریری ایڈمنسٹریشن لائبریری

قیمت ۳ روپے

۱۹۴۴ء

دوسرا ایڈیشن - ۱۰۰۰



اُس کے ارپن

جس نے فرمایا ہے کہ :-

”... تو جو کھائے جو آہوتی دے جو (دان) دے جو تپ کرے اور چاہے جو کچھ بھی تو کرے۔ وہ سب کچھ تو میرے ارپن کرے“
(گیتا - ادھیائے ۹)

”تم کہو کہ میری نماز میرے تمام اعمال وقت (حتے کہ) میری زندگی اور میری موت اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے“

(قرآن - س پارہ ۸ - سورۃ النام)
راما نند ساگر

فہرست

۱۱	..	..	..	پیش لفظ - از راجندر سنگھ بیدی ..
۲۵	..	..	..	تشہ تکمیل ..
۴۹	..	..	..	کھڑک ..
۶۵	..	..	..	جابل ..
۷۸	..	..	..	یہ بھی آدمی ہیں ..
۸۴	..	..	..	گبانو ..
۹۷	..	..	..	تہرب ..
۱۰۱	..	..	..	دو کیا کا ہمدرد ..
۱۰۵	..	..	..	وزیر اعظم ..
۱۱۷	..	..	..	باسمہ پیسے ..
۱۲۳	..	..	..	بیکار ..
۱۳۴	..	..	..	بڑا بھائی ..

۱۴۸	..	..	..	..	چھوٹا بھائی ..
۱۶۲	..	..	..	..	وان ..
۱۶۴	..	..	..	..	غلامی ..
۱۶۸	..	..	..	..	کنجش کے بعد ..
۱۷۷	..	..	..	..	زودیشیاں ..
۲۰۴	..	..	..	..	موت کے ابتر سے

دوسرا ایڈیشن کا دیباچہ

جوار بھٹا کا دوسرا ایڈیشن پیش کرتے وقت ہمیں اس بات پر فخر محسوس ہوتا ہے کہ پہلے پہل ہمیں نے اس مصنف کو ادب اور ادب کی محفل میں پیش کیا۔ جس نے اس محفل میں داخل ہوتے ہی اسکی اولین صف میں اپنی جگہ پیدا کر لی اور جس کا شمار آج اردو کے چند اہل نگہ جوڑی کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ جوار بھٹا کو شائع ہوتے ہی وہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ جوار دو کے جدید افسانوی ادب کی بہت کم کتب کا میسر آ سکی۔ چند مہینوں ہی میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن کاغذ کی نایابی وغیرہ قسم کی چند مجبوریوں کے باعث ہمیں تاخیر برداشت کرنی پڑی۔ جسکے لئے ہم صاحب کتاب کے مداحوں سے عفو خواہ ہیں۔

جوار بھٹا اور اسکے مصنف جناب راما نند ساگر کی تعریف میں ایسی ایسی ہستیاں کے قلم جھیش میں آچکے ہیں۔ جنہیں ہندوستان بھر میں ادب اور ادب کے متعلق سنہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ قریب قریب تمام مستند ادبی رسائل نے انکے کمال فن کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ انکے متعلق ہمارا مزید کچھ لکھنا ایسے شایان شان نہ ہوگا۔ ہمارے لئے تو یہ فخر کیا کم ہے کہ نہ صرف جوار بھٹا بلکہ انکے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ”آئینے“ بھی ہمارے واسطے پیش

کیا عیار رہا ہے۔

مصنف نے محفلِ ادب میں اپنے لئے جو اہم جگہ پیدا کر لی ہے۔ اسکے پیش نظر ہم پر آئندہ زمانے کے ادبی مورخ کو یہ اطلاع بہم پہنچانا لازم آتا ہے کہ اسمیں مصنف کے چند بالکل ابتدائی افسانے بھی شامل کئے گئے ہیں تاکہ اسکے فن کی تمام ارتقائی منازل کا صحیح جائزہ لیا جاسکے مثال کے طور پر مصنف نے اپنی زندگی میں جو پہلا افسانہ لکھا۔ وہ ”کنجش کے بعد“ ہے۔ چنانچہ ہر افسانہ کے ساتھ تصنیف کی تاریخ لکھ دی گئی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں جن عزیزوں کی مدد ہمارے شامل حال رہی۔ ان میں سے جناب رام لال طاٹھہ اور مشہور افسانہ نگار جناب راجندر سنگھ بیدی کے ہم خاص طور پر بہت ممنون ہیں۔ کماؤل الذکر کی وساطت ہی سے ہم مصنف سے متعارف ہوئے اور مؤخر الذکر نے نہایت محنت سے جوار بھٹا پر ایک سیر حاصل تنقیدی مباحثہ لکھا۔

ناشران

پیش لفظ

ادبی طوائف الملوکی کے ان دلوں میں افسانے کے متعلق کوئی کلبہ قائم کرنا مشکل ہے۔ واقعات اور حالات کے نوع بہ نوع بیان یا تاثرات کی ایک لمبی سی فہرست کو بھی افسانے کے نام سے پیش کیا جاتا ہے یا یہ ہم بالذکر کے اس قول کو کہ *There is essentially a story* (افسانہ بالذکر) لازم الوجود ہے، کوئی منہیں جھٹلا سکتا۔ اب یہ افسانویت یا کہانی پن کیا ہے اسے معین الفاظ میں بیان کرنا نہ صرف بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا ہے بلکہ اس کی تعریف میں زیادہ الجھاؤ پیدا کرنا ہے۔ جتنے افسانے میں اتنی ہی تعریفیں ہیں اور کسی معین تعریف کے ناممکن ہونے کی وجہ سے ہمیں منطقی *conclusion* (نتیجہ) انداز میں، اوپر کے الفاظ میں سے ایک منہنی دلیل کی تلاش ہوتی ہے اور وہ دلیل یہ ہے کہ اُس ایک واقعہ کا بیان جس میں محقق حالات کا نوع بہ نوع بیان یا تاثرات کی لمبی سی فہرست نہ ہو۔۔۔۔۔ افسانہ ہے!

رامانند ساگر کے افسانے دیکھنے سے مجھے دو باتوں کا احساس ہوا جن میں سے پہلے علامہ یا غامبانہ طور پر، ایک شعر کا ذکر ہے "کی کیفیت لازم ہو۔۔۔"

اول یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں پر باستانی اُمت کے ہنرمندوں میں خواہ وہ اسکے کی طرف مائل ہوں یا نہ ہوں کہانی کا عنصر ضرور موجود ہوتا ہے۔ ان کے افسانے محض وقوعات کی فہرس یا دل کو برگشتہ کر دینے والے بیانات نہیں ہوتے۔ کہانی جس کا ایک نقشہ ان کے ذہن میں ہے، بنانے کے لئے وہ ایک فنکار کی طرح اپنے آلات استعمال کرتے ہیں، تاکہ اسے ایک معین شکل دی جائے۔ دوسری خوبی جو ان میں بدرجہ اتم موجود ہے وہ اُن کی عوام تک پہنچنے کی کوشش ہے جس کے حصول کے لئے وہ بار بار فن کی بھی اتنی پروا نہیں کرتے اور فطرتا ایسی نفسیاتی الجھنوں کو لانے سے گریز کرتے ہیں جو ایک عام سمجھ بوجھ والے آدمی کی اہم پر کسی طرح بار ثابت ہوں، انہیں بخوبی درک ہے کہ انہیں عوام سے لہجی عناد ہے اور میرے خیال میں ان کی یہی ایک عفت انہیں عوام میں روزمرہ زیادہ مقبول کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوگی۔ کیونکہ یہ عفت ایسی ہے جس کے حصول کے لئے بالآخر خونی ادیب کو بعد از ہزار رسوائی عوام کی طرف بائیل ہونا پڑتا ہے۔

رمانند ساگر کے بعض افسانوں میں مصلح کا جذ بہ اور جذبات پرستی پائی جاتی ہے جسے چھپانے کی انہوں نے ضرورت نہیں سمجھی۔ یوں ہوا، کا واقعہ انہیں اتنا مرغوب نہیں لگتا کہ انہیں ایسا ہونا چاہیے، کی سرگزشت عزیز ہے۔ اس بات کی فوری بے غماہی کرتی ہے کہ انہیں خواص کی نسبت عوام زیادہ عزیز ہیں۔ عوام مصلح پسند اور جذبات پرست ہوتے ہیں اپنے دماغ پر بہت زیادہ زور دیکر سوچنے کے عادی نہیں ہوتے اور ہمیشہ اس بات

کے نام سے پہلے بنا کر نہ کھڑے کر دے اور زندگی کی وار و اتوں کے بہانے سے خیالی باتیں بیان کر کے نہ رہ جائے یعنی اسے آدمی کی سیرت اور زندگی کے کاروبار سے غیر معمولی طور پر اوسچی واقفیت ہونا چاہیے خواہ وہ حقیقت اخبار نویسوں کی طرح آنکھوں سے دیکھ کر حاصل کرے یا اپنے جذبات کے دیر یا میں غوطے لگا کر قصہ تو بہر حال سوچا جاتا ہے سیرتوں اور صورتوں کے نقش بنائے اور مٹائے جاتے ہیں جب تک کہ وہ اصل کے مطابق نہ ہو جائیں چنانچہ ان عقائد کے جواز میں طاسطائی کی ”جنگ اور صلح“ اور ”اینا کہ میں“ کے چند ابواب پیش کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن بیانات طاسطائی کے خلوص کی تحسین میں جاتی ہے کہ اس نے اپنی تصانیف میں حقیقت اور افسانے کے درمیان فرق نہیں رکھا۔ زیر نظر مجموعے کے افسانے ”بڑا بھائی“ میں مذکورہ بیان کے مطابق پہلی کوشش کہ وہ اسے اور ش یا مثالی بڑا بھائی بناوے اصلاح پسندی اور جذبات پرستی کا ایک کامیاب نمونہ ہے ہری شنکر کی مرتبی ہوئی ماں کی دعا — ”بھگوان تمہیں بوڑھوں جتنی عقل دے“ اور دعا کا کارگر ہو کر اسے قبل از وقت متین اور سنجیدہ بوڑھا بنا دینا اور ہری شنکر کا اپنے بھائی کے عجز و جان پر کھیل جانا جذبات کی انگریز کے لحاظ سے خوب ہے لیکن انسان کی فطری کمینگی کے پیش نظر کمزور۔ لیکن اس تجزیہ کے باوجود آنکھوں سے بے اختیار آنسو اٹھنے چلے آتے ہیں اور عام انسان کا مردہ عمل یہی ہے۔ جہاں تک طاسطائی کے کلیے کے آخری حصے کا تعلق ہے، مناسب ارتقائی مراحل طے نہ کرنے کی وجہ سے ساگر کے اس افسانے کی

حقیقت اور افسانے کے درمیان کی تقسیم کی بکیر صاف دکھائی دے جاتی ہے۔
لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ مصنف عوام کے دل کو ٹٹولنے کے پیش نظر عمدہ تحقیقت
کو نظر انداز کر دے۔

افسانہ "یہ بھی آدمی ہیں" انسانی تہذیب و تمدن پر ایک لطیف طنز ہے
ایک ننھا پرندہ پیدائش کے چند روز بعد کسی باغ میں ریشمی کپڑوں میں بلبوس
بچوں اور نفیس جھلمل کرتی ساڑھیوں پہنے کیا ریلوں میں خرا مال خرا مال ٹھہرتی رہتی
عورتوں کی طرف دیکھ کر استعجاب اپنی ماں سے پوچھتا ہے۔۔۔۔۔ "ماں یہ
کون ہیں؟ اور جواب پاتا ہے "یہ آدمی ہیں" تو اُس کے ننھے سے دل میں آدمی
بننے کی خواہش موجزن ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب اس کے پردوں میں قوت
پر واز پیدا ہوتی ہے تو اُسے جھلمل کرتی ساڑھیوں سے پر بھی ردائی کے ایک
ایک ٹکڑے کے لئے لڑتے ہوئے مزدوروں کے جھوٹے پڑے دکھائی دیتے ہیں
تو وہ ویسے ہی حیرت سے ماں سے سوال کرتا ہے۔۔۔۔۔ "ماں یہ کون ہیں"
تو وہ جواب دیتی ہے "بلیا یہ بھی آدمی ہیں" اور اُس کے چھوٹے سے دل کو دھچکا
گتا ہے۔ *diam-o-Flaherty* نے اس رنگ میں بہت سی حکایات و
طنز بات لکھی ہیں اور وہ بہت کارگر ہیں۔ اس طرح اس افسانے میں مصنف
کا دل ایک پرندے کے دل کے ساتھ دھڑکتا ہے اور نوازائیدہ پرندہ بطور
Vehicle (آلہ کار) کے نہایت موزوں ہے کیونکہ وہ دنیا کی اقدار سے واقف
نہیں اور مصنف کو انسان کے غیر متوازی درجات کے متعلق طنز کرنے کا موقع
دیتا ہے۔ مصنف پرندے کی *Detached* صورت میں نوع انسانی کو دیکھتا

اُٹھاتے ہیں جیسے نقشے کے رحم کے جذبات جنہیں وہ ساری عمر داتا رہا تھا، آخر
 عمر میں ایک زخمی گھوڑی کو دیکھ کر اُبل آئے تھے اور وہ بے تحاشہ رو دیا تھا، آخر
 میں کلیان خود کشی کر لیتا ہے۔ جاہل، کی تصویر قابلِ داد ہے۔ اُس کے
 جسم کی بناوٹ بھی کچھ عجیبے سم کی تھی مضبوط جڑے ایک آہنیں عزم ظاہر
 کرتے تھے اور عقابِ ناک اسے زیادہ ہیبت ناک بنا رہی تھی لیکن اس کے خلاف
 آنکھوں میں کرختگی کا نام و نشان نہ تھا۔ اُس کی نگاہوں میں جیسے شرمیلی تھی
 اُس کی ہر وقت ڈبڈبائی رہنے والی آنکھوں کے آگے پانی کی ایک ہلکی سی اوٹ
 ہوتی جس کے پیچھے سے ان میں مظلومیت کا رنگ چمکتا تھا۔ یہ آنکھیں ہی تھیں
 جو اس کی ظاہری شکل سے پیدا ہونے والی کرختگی کو ایک حد تک ملامت کر دیتی تھیں
 یا پھر اس کی چال جس میں ٹانگوں کی مضبوط گھٹن کے باوجود نہ کھڑا ہٹ یہ ظاہر
 کر رہی تھی کہ یہ اس مسافر کی طرح غیر یقینی استقلال رکھتا ہے جسے اپنی
 منزل کا رخ ٹھیک ٹھیک نہ معلوم ہو۔ اور جو محض چلتے جانے کی خاطر دنگا
 ہوئے قدم اٹھاتا ہوا چلا جاتا ہے۔

”نقشہ نگار“ میں ایک سیلاب ہے جو کہ پڑھنے والے کو رات بھر ہالے جاتا ہے اسکے
 علاوہ ”وزیرِ اعظم“ کلرک“ ”باسٹھ پیس“ وغیرہ اچھے افسانے ہیں اور ”یران اور انوں پر“
 ہی موقوف نہیں۔ نوٹ کے لسنر سے جو کہ بظاہر ایک ڈائری ہے یہیں کئی افسانوں پر
 ملے صنف ایک نپ وق کا مرقع ہے اور حال ہی میں سنے تو دلیم سے شفا حاصل کر کے آیا
 ہے۔ اقتباس میں ہنگام و خفت۔ جبکہ وہ عزیز و نکر اور اپنی و انست میں یہیں آخری
 باہل رہا تھا کے تاثرات قلبیہ کئے گئے ہیں۔

کامواد دیتی ہے مثلاً۔

یکم مئی کو لاہور سے چل کر آج رات سری نگر پہنچا۔ لاہور سے
روانگی کا نظارہ تصور میں آنے ہی آنسو ڈپڑا آتے ہیں دوستوں
کا جھوم اور پھر اس مجمع پر یہ خیال غالب کہ مبادا یہ ہماری آخری
 ملاقات ہو اس جذبہ کی موجودگی میں یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ
کس طرح سائے کا سارا مجمع آنسوؤں سے لدا ہوا ایک بادل
 دکھائی دے رہا تھا۔ دوستوں کا منہ پھیر کر آنسو پونچھ لینا اور پھر
 میری طرف ہنسنے ہوئے دیکھنا۔ وہ اپنی حالت میں مجھے بنا
 رہے تھے لیکن وحقیقت میں انہیں بنا رہا تھا۔ میں ان کی
 ہنسی کے پس پردہ چھا جھم برستے ہوئے آنسو دیکھ رہا تھا ان
 میں سے کوئی بھی کھل کر بات نہیں کرنے پاتا تھا اور میں
 جانتا تھا کہ ان کے گلے آنسوؤں سے بھر آئے ہیں اس نخوس
 بیماری کا خیال بھی مجھے جس قدر پریشان نہ کر سکا اس سے
 زیادہ تکلیف مجھے اس رفت انگیز نظارہ نے پہنچائی۔

دوسری بات جو سنا کر میں دکھائی دیتی ہے وہ احساسات
 کی لطافت ہے۔ ان کے اپنے قول کے مطابق وق ان کی حساس طبیعت کا شاخصہ
 ہے اگرچہ اس کی ناقص شکل کہ وق کے مریض کی حسیات بہت تیز و جافی میں بھی
 اتنی ہی درست ہے۔ بلکہ حکما کا قول ہے کہ یہ کمزوری طبیعت میں ایک خاص
 قسم کی قوت پیدا کر دیتی ہے جو کہ عام آدمیوں میں دیکھنے میں

نہیں آتی بعض وقت بہر کسی کے *document* کا سبب ہوتی ہے۔ بہر کیف یہ تو درست ہے کہ جس شخص کو یہ مرض ہو اس کے احساسات نہایت تیز ہو جاتے ہیں۔ طبی رنجیت زیادہ ہو جاتی ہے۔ ان احساسات کی تیزی اور جذبات کی فراوانی نے مجھے ان کے مطالعہ کی طرف مائل کیا اور فی الواقع ان کی تحریر کا وہ حصہ جو ان کی بیماری سے متعلق ہے نہ صرف انشا پر دانی کا ایک اچھا نمونہ ہے بلکہ میری توقع کے بموجب ایک انسانی دستاویز *Human Document* ہے۔

جب تک پتہ چلا کہ میں تنپ وق کا ایک مریض ہوں ایک عجیب کیفیت طاری ہے۔ ماضی اپنے دامن میں میری نشہ نگہیں آرزو میں لئے تہایت بیرونی سے مسکرا رہا ہے۔ ایسا معلوم دیتا ہے جیسے کسی امتحان کے ان نے اپنی تمام محنت ایک ایسے کیفیت کو سیراب کر لئے ہیں صرف کہ وہی ہو جس میں حسرت کے پودوں کے سوا کچھ نہیں اگلاتا۔

اگر تنپ وق کا مریض وقتی طور پر بچ بھی رہے تو کیا عمر بھر کے لئے واعدا ہو جاتا ہے۔ یوں کہو کہ قدرت نے ایک تیز فکشن چھوڑا ہے جسکی خاشاک حیات نہ جاسکے گی۔ ایک عجیب کیفیت اگر یا میرا مہر حیات زندگی اور موت کے چکولے کا ہے۔

میرے عزیز دوست طاہر کی چٹھی آئی ہے اس کے جذباتی
 قلم نے دل کے تاروں کو کچھ اس طرح چھیڑ دیا ہے کہ ایک
 پرسوز لغمہ گونج اٹھا ہے اور ایک رفاہیہ کے از خود متحرک
 اٹھنے والے پاؤں کی مانند دو شوخ آنسو بھی آنکھوں کے
 پردوں میں تھرکنے لگے ہیں ایک شوخ اور تنہا سا بادل
 دھوپ میں نہا رہا تھا کہ اس نظارے کی تاب نہ لاکر وہ
 بھی رو دیا۔

گھر والوں کو مریض کا جسم پیارا ہوتا ہے جذبات نہیں

اچانک ارکان قضا و قدر ان کی ہنستی و نیا کو دیکھ کر جل اٹھے
 اور اپنی کمان پر چلے چڑھا کر وہ تیر چھوڑا جس کا پھل اسکے پہلو
 میں ٹوٹ گیا۔

—————
 دق کے مرض کی اس سے بہتر تعریف ممکن نہیں کیونکہ یہ ایک تیر
 نیمکش یا ایک ایسا تیر ہے جس کا پھل پہلو میں ٹوٹ جاتا ہے اور موت آتی
 ہے پر نہیں آتی کی سہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ ساگر کی تحریر کا ماہر عنبر دق
 یا دوسرے لفظوں میں نازک احساسات ہیں۔ یہ ادنیٰ فن کے معیار و نمک
 پر کسے جاسکیں یا نہ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ تپ دق کے مریض کے جذبات
 کی تماش جو ان صفحات میں مرقوم ہے ایسی ہے کہ کوئی شخص انہیں پڑھنے

کے بعد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور پھر اس شخص کے تاثرات جس کا اپنا قول ہے کہ سینے ٹوریم میں چلے جانا اتنا بڑا سانحہ نہیں جتنا کہ اس فخر عینی سے صحیح و سلامت واپس چلے آنا۔ بلکہ ڈائری کے آخر میں ایک سخت طنزیہ پیرایہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حکومتوں نے وق سے بچنے کے لئے سینے ٹوریم تو بنا دیئے ہیں لیکن سینے ٹوریم سے بچ نکلنے کے بعد، معاش کے لئے لڑکیوں اور محنت کشی کی زندگی میں پھنس کر پھر وق مول لے لینے کا کوئی علاج نہیں سوچا۔

سینے ٹوریم میں بسنے والوں کا مذاق کس قدر سمیٹ ناک ہے وہاں کی غم اندوز سے بھری ہوئی زندگی میں ایسے ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو کہ موت کے پس نظر میں نہایت خوفناک دکھائی دیتے ہیں اور کبھی کبھار ایک اچھے افسانے کا مواد بہم پہنچاتے ہیں۔ ”سینے ٹوریم کی مغموم فضا میں کبھی کبھی چند مریضوں کی بواجمیاں تفریح کا سامان پیدا کر دیتی ہیں۔ اگلے روز ایک لیٹن نے ڈاکٹر پر جھوٹ موٹ ثابت کرنے کے لئے کہ مجھے سخت بخار ہے نقرہ مایٹر کو بغل میں لینے کی بجائے رعنائی کے اندر رکھی ہوئی کانگریسی دایک طرح کی لنگی (پیرکچہ) دیر رکھ کے دکھا دیا۔ نقرہ مایٹر دیکھا تو ہنسی کے ماتے ڈاکٹر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ درحقیقت پارہ ۱۰ ڈگری تک جا چکا تھا!۔۔۔۔۔ بواجمی ہنکا مہا گرم است در بازار ما“

بقول ”نہنہا شاعر مازک طبعیم“ افسانہ نگار ہونے کے علاوہ ساگر کی زبان سے اسکے شاعر ہونے کا کبھی گمان ہوتا ہے۔ ان کے بیان میں شعریت

برجستگی اور خیالات میں وارفتگی دکھائی دیتی ہے اگرچہ شعروں کے کثرت استعمال نے اسے خواہ مخواہ مصافحتی رنگ دے دیا ہے۔ لیکن وہ اشعار بر محل ہونے ہیں اور ذہن پر گزراں نہیں گزرتے ان کی شعریت سے بھری تحریر ملاحظہ ہو۔

گہرے اندھیرے میں سے پل کی محرابیں ایک ایک کر کے اُجاگر
 ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ عین اس طرح جیسے پانی کی اس خاموش
 روانی کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے میری زندگی کے وہ حسین اور
 سنہری لمحے باری باری ماضی کی یاد کے اندھیرے میں سے
 اُجاگر ہونے چلے جا رہے ہیں جنہیں میں زندگی کی چور کر دینے
 والی کلفتوں کا واحد خوشگوار ماحصل سمجھتا ہوں۔

وہ لمحے جب کسی دوپٹے کے خواتین رنگ نے ہمارے دل کو
 خون کر دیا جب کسی کے مسکراتے ہوئے لبوں نے ہمیں چہرہ
 لگا یا جب کسی نے ہنستے ہنستے ہم سے دو باتیں کہیں اور
 ہمارے دامن کو سدا بہار پھولوں سے بھر دیا۔ یا جب کسی نے
 جھکی ہوئی شرمیلی آنکھوں سے کچھ اس طرح دیکھا۔ گو یا ایک
 نیرنگ چھوڑا ہو۔ یہی وہ پند ہے جو ہمیں اس بات کا یقین
 دلاتے ہیں کہ جو رنگین خواب ہم نیم خوابی کی حالت میں دیکھا
 کرتے ہیں وہ محض سراب نہیں بلکہ کبھی کبھی حقیقت کی صورت
 بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ گو یہ لمحے انسان کی زندگی میں خال

خاں آتے ہیں باہنہمان کا سلسلہ لانتنا ہی ہے کیونکہ ایسے لمحے
ہر شخص کی زندگی کے طویل اندھیا سے میں کہیں کہیں ایک بدی
روشنی کی مانند نور افشاں ہیں چنانچہ ان رنگین روشنیوں کا
سلسلہ بھی بہت دراز ہے۔ اس جہلم کی طرح بلکہ اس
سے بھی زیادہ جہلم تو بحیرہ عرب سے مل کر اپنی تکمیل کی لتیا
ہے لیکن ان رنگین خواب نما تحقیقتوں کا بیان ہمیشہ نشتر
تکمیل رہے گا۔

دشت تکمیل

کہیں کہیں ساگر زندگی کے تنخہ تجربوں کے پیش نظر جھجھکا اٹھتا ہے۔
”جاہل“ میں جب نو آمدہ مریض کو اپنے کمرے میں ڈبڑھ سوپے کی پوٹلی کے ساتھ
ایک رقم منجانب کلیان ملتا ہے تو اس پر تحریر ہوتا ہے ”بھگوان کے لئے اپنی لوگوں
کو نہ بتانا۔ ورنہ یہ تم سے روپے چھین لیں گے۔ انکی تہذیب کا قانون یہی ہے
کہ وہ دسے نہیں سکتا چھین سکتا ہے“ چھوٹا بھائی ”میں کل کی نفسیاتی
تحلیل خوب ہے۔“ سامنے امیر اکبر کے بازار میں ایک نوجوان کمری
کے ایک ڈنڈے پر نفسی سیک کی نکٹائیاں لگائے بیچ رہا تھا۔ اس نے شاید دو
سال ہوئے بی۔ اے پاس کیا تھا۔ اس نے نکٹائیاں کل کے آگے کر دیں کل
ٹھٹک گیا اور اسکے منہ کی جانب دیکھنے لگا وہ منہ سے کچھ نہیں بولا البتہ ایسی نظروں
سے دیکھتا رہا گو یا کہہ رہا ہو کہ کس کسٹم کے پیچھے جا رہے ہو کل باؤ! ایک ننھی
نکٹائی خرید لو۔ تمہاری نکٹائی پھٹ گئی ہے۔ تمہیں اس وقت کسٹم سے زیادہ

نگٹائی کی ضرورت ہے، پھر ایک کیا کئی کسٹم دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اے دیکھتے
 کیا ہو ضرورت ہے کیوں نہیں میری پٹی ہوئی نگٹائی دیکھ رہے ہو جب میں کالج
 میں پڑھا کرتا تھا تو ہر روز نئی نگٹائی لگایا کرتا تھا اب بھی مجھے کہیں کلر کی مل
 لینے دو۔ اگر آدھی تنخواہ ہر مہینے نگٹائیوں پر نہ خرچ کر دوں تو کہنا۔ تمہیں
 کم از کم ایک تو ضرور خرید لینی چاہیئے۔ بڑے بھائی سے ڈرتے ہو۔ یہ کم نہیں
 جو اس پر بھی قبضہ کرے۔ مذکورہ بالا بیان میں ہماری معاشرت پر
 ایک تکیہ نشتر بھی چلایا گیا ہے۔ اب مجھے کلر کی مل لینے دو۔
 تمہیں اس وقت کسٹم سے زیادہ نگٹائی کی ضرورت ہے، پھر ایک کیا کئی کسٹم
 دستیاب ہو سکتی ہیں..... اور اس میں اپنے تاثرات اور سر شخص کو داندہ
 بنا کر منعکس کرنے کا فن قابل تحسین ہے۔

راجندر سنگھ بیدی

تشہ تکمیل

کیا آپ کبھی خواب دیکھے ہیں۔ وہ خواب نہیں جو آپ نیند کی حالت میں دیکھتے ہیں۔ بلکہ وہ خواب جو آپ جاگتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس وقت جب آپ چار پاٹی پر لیٹ تو جاتے ہیں۔ لیکن نیند نہیں آتی۔ یا پھر جب آپ کے پاس کوئی اور بات سوچنے کے لئے نہیں ہوتی۔ اور آپ موٹر میں کسی لمبے سفر پر جا رہے ہوتے ہیں۔ یا اگر خوش قسمتی سے آپ کو ریل میں تیسرے درجہ کا ڈبرہ قریب قریب خالی مل جائے۔ اور آپ کا ہم مذاق دہاں کوئی نہ بیٹھا ہو۔ اور نہ وہاں چھیڑوں میں لپٹی ہوئی کوئی حسینہ ہی بیٹھی ہو۔ تب اس سے بھی بہتر موقع وہ ہے۔ جب آپ کسی بھی سی کشتی میں پاؤں پسائے اپنی نیم وا انکھوں سے پانی کی ہموار سطح پر اپنے تن میں تیرتے ہوئے دیکھیں۔ جیسا

کہ اس وقت میں اپنے ننہیں پار ہا ہوں۔ جہلم کا یہ سفری مائل پانی کس قدر سکون بخش ہے۔ وہ سامنے امیر اکدل پل پر سے جو سڑک گذر رہی ہے اس میں اور اس آبِ شاہراہ میں کس قدر تفاوت ہے۔ وہ انسانی ہاتھوں سے بنائی ہوئی سڑک۔ شور و غوغا سے پُر۔ گرد و غبار سے اٹی ہوئی۔ ہر وقت راگبیروں کی ریل پیل۔ اور پھر ہر لمحہ خلاف مرضی کسی واقف کار سے ملاقات کا حادثہ ہو جانے کا خطرہ۔ اور دوسری جانب یہ آبِ راستہ۔ قدرت کے ہاتھوں میں کیا گیا۔ سکون زا۔ گرد و غبار کا نام تک نہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک بار اپنے لنگر کھول کے کشتی کو موجوں کے حوالہ کر دیا کہ وسط دریا کی فضا نے آپ پر کچھ ایسا جا دو کیا۔ کہ آپ عاگتے ہوئے بھی خواب دیکھنے لگے۔ وہی خواب جن کا میں ذکر کر رہا تھا۔ اور مجھے ان خوابوں سے کچھ ایسا انس ہے کہ میں ہمیشہ یہی کوشش کرتا ہوں۔ کہ امیر اکدل سے گھر جاتے وقت کشتی ہی میں سفر کروں۔ اور جب میں شکاے میں نیم دراز ہوا اپنے ارد گرد پانی کی لہروں کا ناچ دیکھ رہا ہوں۔ اور ناؤ کا شمیری کھویا بھی نہایت مہارت سے ڈانڈ چلاتا چلاتا اس فضا سے متاثر ہو کر اپنی زبان میں اور ایک خاصے میں پکارا اٹھتا ہے۔

اتنی روز و مدد دار و تدمن ہا لگئے پاری
 ہٹھہر او قدم یار و کن تھو بد نئے زاری
 دہ سینہ رٹم گرمی کہ مہر شرمی شرمی
 تس کو نہ ولس نرمی پس پتھہ مہر نجم خوری

اے میرے حسین دوست۔ ایک ذرا ٹھہر جا۔ میں تیرے قدموں پر قربان۔ انہیں ذرا روک۔ اور کان دھر کے سن۔ کہ میری آواز کی کیا ہے۔

میں نے شرارِ عشق کو اپنے سینہ ہی میں چھپا رکھنے کی سعی کی۔ اور شرماتے شرماتے ہی اپنا یہ حال کہ لیا۔ اے خدا جس کے پیچھے میں نے اس قدر خوار می اٹھاٹی اس کے دل میں کیوں نرمی نہیں آتی۔

اس وقت نہ پوچھیے۔ کہ تصور انسان کو کہاں کہاں لے اڑتا ہے۔ اور پھر خوابوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ میں ایک راہ بھول گئے شہزادہ کی صورت میں اپنے تئیں ایک خنک میں پاتا ہوں۔ اور وہاں ایک نوجوان چھپیلی کو الٹن مجھ پر ترس کھا کر مجھے اوک سے ہی تھوڑا سا دودھ پلاتی ہے۔ دودھ پیتے پیتے میں آنکھیں اوپر اٹھا کر اسکی آنکھوں میں ڈال دیتا ہوں۔ دودھ میرے ہاتھوں سے بہنے ہوئے اوک میں سے چھلکتا چلا جاتا ہے۔ اور میں اسکے نینوں سے ٹپکتا ہوا مدھور س پٹے جاتا ہوں۔ حتیٰ کہ ساری کی ساری منگی خالی ہو جاتی ہے اور ہم چونک پڑتے ہیں۔ اور دیکھتے ہیں۔ کہ زمین پر دودھ کی ندی بہہ رہی ہے اور پامائے سینوں میں مجھ کے دریا۔۔۔۔۔ اور ان نین ندیوں کے شکم پر میرا محل تعمیر ہو جاتا ہے، جہاں راجکاری اور گوالن۔

اچانک میری نگاہ پیچھ کو جاتی ہے۔ کھویا بھی کسی کا خواب دیکھ رہا ہے۔

جو اس کی آنکھوں میں صاف ناچ رہا ہے۔ لیکن اسکے ہاتھ ایک بے جان مشین کی
 کی طرح ڈانڈوں پر کام کرتے ہیں۔ وہ دریا کے دھندلے کنارے کی جانب
 نظر میں کاڑھے ہوئے ہے۔ جہاں پھیلنے ہوئے اندھیرے میں ایک کھڑکی میں
 سے روشنی آرہی ہے۔ شاید وہاں کوئی ہے جس کے خواب وہ بھی دیکھ رہا ہے
 یا اس مکان اور مکان والی سے وابستہ کوئی روحانی افسانہ اُسے پھر سے
 یاد آگیا ہے۔ ڈانڈا اب بھی اُسی طرح چل رہے ہیں۔ شراب
 شر۔ شراب شر۔ شراب شر۔ اور تشکارہ رواں ہے۔ میں پھر خواب
 دیکھتا ہوں۔

اُسے سائیکل پر دفتر کو بھاگا جا رہا ہوں۔ کہ اچانک ایک موٹر کی جھپٹ
 میں آجاتا ہوں۔ اور مجھے دنیا گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک لمبی بیہوشی
 مجھ پر غلبہ پالیتی ہے۔ بیہوشی سے قبل مجھے محض اتنا یاد ہوتا ہے۔ کہ میں
 نے موٹر میں ایک شعلہ جوالا دیکھا تھا۔ جسکی کنول ایسی آنکھوں سے نکلیں
 ہی مجھے نہ جانے کیا ہوا تھا کہ میں اسکی موٹر کے آگے گھر چلا۔ اور جب
 ہوش آیا۔ تب بھی اُنہی دو کنول کے بیچوں ایسی لمبی اور گلابی ڈوروں والی آنکھوں
 کو اپنے سامنے پاتا ہوں۔ وہ کنول کے ڈنٹھلوں ایسے دو بازو میرے پلنگ پر
 رکھے اپنی لمبی مخروطی انگلیوں سے میری انگلیوں کو چپکا رہی ہے۔ میں ایک
 ہی نظر میں بھانپ لیتا ہوں۔ کہ یہ کوئی راجکارہ ہی ہے۔ اور میں ایک راج محل
 میں ہوں۔ ہو بہو اُسی طرح کا محل جس میں راجکارہ اور گوالن کا خواب دیکھا
 تھا۔ گو یا میرے تصور نے جو محل اپنے مذاق کے موافق تیار کر رکھا ہے۔ ہر جگہ

مجھے وہی میسر آتا ہے۔ اسکی انگلیوں کے مس سے مجھے اپنے قلب و جگر میں ایک
 خوابیدہ نغمہ گونجتا سناؤ دیتا ہے۔ گو باد اس کی انگلیاں مضرب ہیں۔ اور میری انگلیاں
 کسی سنار کے تار..... اچانک میں گھبراسا اٹھتا ہوں۔ اسکے سامنے اپنی
 حقیقت کھول دینا چاہتا ہوں۔ تاکہ اُسے کوئی غلط فہمی نہ رہ جائے۔ لیکن پھر
 دل کہتا ہے۔ کہ ابھی آنکھ نہ کھول۔ اسی طرح یہ ہوش پڑا رہ۔ مبادا ابیر حسین
 نغمہ حقیقت کے کہ کش شور میں گم ہو جائے۔ میں آنکھیں بند کئے رہتا ہوں
 لیکن زبان بے قابو ہو کر بول اٹھتی ہے۔ ”لیکن میں تو ایک غریب کلرک ہوں
 اچکاری۔۔۔۔۔“ میرے کانوں میں ایک نقرئی گھنٹیوں ایسی آواز آتی ہے
 ”ایسا نہ کہو۔ میرے راجہ“ اور میں اپنے گالوں کے قریب کسی کا گرم گرم معطر
 سانس محسوس کرتا ہوں۔ فوراً آنکھیں کھول دیتا ہوں۔ اور۔۔۔۔۔ میں
 اور راجکاری.....

طرح پھر گارہا ہے۔
 باغِ نشاط کے گلونا ز کران کران و لو
 ضائع کر محسوس ہوتا راما بیر بران و لو
 اے باغِ نشاط کے پھولو دیا اُن ایسے نازک شگفتہ رنگین او
 دلکش حینو ناز خرامی کے ساتھ میرے قریب آؤ۔
 اے میرے حسین محبوب تو نے دمخض میرا دل ہی نہیں بلکہ
 سر سے لے کر پیر تک مجھے تباہ و برباد کر دیا داب بھی

رہی ہوں۔ لیکن آپ کے تازہ ترس افسانہ ”شمع“ نے کہ یا مجھے بھی ”شمع“ بنا دیا ہے۔ خدا کے لئے اپنے افسانوں میں اس قدر سوز نہ بھرا نیچے کسی کے مازک دل کا بھی خیال رکھیے۔ کیا آپ کے دل میں سچ مچ اسی قدر سوز بھرا ہوا ہے؟ کیا آج تک کسی نے آپ کی اس آگ پر پریم کا پانی چھڑکنے کی کوشش نہیں کی۔ کاش میں — اور میں فوراً اس کا ہمت افزا جواب دیتا ہوں۔ جس کے جواب میں وہ اپنا فوٹو بھی بھیج دیتی ہے۔ اور پھر کچھ بعد دیکھ کر کئی خطوط آتے ہیں۔ لیکن میں آگ لگا کر ایک ویو تائی مورتی کی طرح خاموش رہتا ہوں۔ البتہ ہر نئے خط سے ایک نیا لطف نہ صرف میں بلکہ میری ”چاند“ بھی اٹھاتی ہے۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ مجھے حسینوں کے جذبات۔ سب سے اس طرح کھیلنا خوب پسند ہے۔ اور برہنہ حسینہ کے اس طرح ”زخمی“ ہونے کی خبر سنتے ہی وہ میرے گلے میں باپیں ڈال کر میرے ہونٹوں پر اپنے بائیک مارک ہونٹ رکھ کر کہتی ہے ”میرے جادو گر۔ تو تمہارے نئے افسانے نے مجھے بھی پلاٹ مل گیا۔ اور سچ مچ مجھے ان ناکام عشق حسینوں کی جانب سے آنے والے خطوط میں قلمبند کئے گئے جذبات سے بہترین افسانہ مل جاتے ہیں۔ اور انہی افسانوں کے باعث جن میں حقیقت کی تپش ہوتی ہے میری شہرت کو پر لگ جاتے ہیں۔“

حتیٰ کہ جہلم میں بہتے بہتے اس ”ناکامی حسن“ اور اس کی بنیادوں پر کھڑے کئے گئے میرے ”تھر شہرت“ کا سلسلہ کنائے سے ٹکراتی ہوئی نہروں کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ کی طرح یہاں تک دراز ہو جاتا ہے کہ میں یا میری چاند

جب بھی کسی حسینہ کے ہاں جاتے ہیں۔ تو وہاں میری تصویر ایسی عکسنگی ہوتی ہے
 جہاں ہر وقت اسکی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس پر تازہ پھولوں کے ہار لٹکا
 ہوئے ہوتے ہیں۔ اور جس کسی کو میری تصویر پیش کرنے آئی ہو۔ اس نے اپنے تصور
 کی مدد سے ایک حسینہ نوجوان کی تصویر بنائی ہوتی ہے۔ اور میں ہر ایسے مکان
 سے لوٹنے کے بعد اُسے ایک خط لکھتا ہوں۔ کہ ”آج تمہارے پاس وہی شخص آیا
 تھا۔ جس کی تصویر کو تم ہر صبح تازہ پھولوں سے سجاتی ہو“۔ اور پھر
 تصور کی آنکھوں سے اس حسینہ کا چھٹپٹانا۔ ہاتھ اٹھے ہوئے پر غم کے اس طرح
 نکل جانے پر مارے پھیتاؤ سے کہ ہاتھوں کو مل کر خونیں رنگ دینا اور بھلے
 چینی بڑھ جانے پر دیوانہ وار ہر در و دیوار سے پوچھتے پھرنا کہ ”شاعر کہاں ہے
 ؟“ دیکھتا ہوں۔ یہ نظارہ ہوئے ہوئے اس قدر وسعت اختیار
 کر جاتا ہے۔ کہ زمین و آسمان میں حسینوں کا ایک قیامت زامہ گھٹ ہے۔
 اور ہر جانب سے یہی آواز آرہی ہے۔ ”شاعر کہاں ہے۔ شاعر کہاں ہے۔“
 اور میں عین اس جگہ کے درمیان بیٹھا مسکرا رہا ہوں۔ لیکن
 پیار کی تریاوی نے ان کی آنکھوں پر کچھ ایسا پردہ ڈال دیا ہے۔ کہ وہ مجھ
 ہی سے پوچھتی ہیں کہ ”شاعر کہاں ہے۔“ اور مجھے پہچان نہیں سکتیں
 مجھی کو بکارتی ہوئی ریزنگر واگر دگھومتی ہیں۔ اور میں خاموشی سے مسکراتا
 ہوا درمیان میں بیٹھا ہوں۔ اس جہہ کدل کے پل تکے اُس پر شور مچا بجھری
 کے وسطی نقطہ کی طرح۔ جس کے گرد اگر دگھنور کا پانی بھنوتا پھرتا ہے۔ آپ
 شاید کہیں۔ کہ ”متم نے تو خواب ہی خواب میں اللہ اور روح کی مفارقت باوجود“

یگانگت“ کا روحانی مسئلہ حل کر لیا ہے۔ ” لیکن یقین جانیئے کہ میں مجازی پیار کی اس حد پر پہنچکے بھی جہاں کثرت وحدت میں سما جاتی ہے۔ اسے روحانیت کا نام دے کر اپنے ان خوابوں میں سے تمام کیف پچوڑ دینے کو تیار نہیں خواہ روحانی مسئلہ حل ہوتا ہے۔ یا نہیں۔ میری بلا سے۔ میرے ہاں تو۔ ع ”

” بنتی نہیں ہے باوہ و ساغر کہے بغیر ”
ڈانڈ ایک بندھی رفتار سے چل رہے ہیں ” شطراپ شتر شطراپ شتر۔ شتر۔ شطراپ شتر۔“

سامنے جبہ کمال کے پل کی محرابوں سے لہریں گمراہی ہیں۔ اور پھر ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھری جاتی ہیں۔ گویا یہ محرابیں دنیا کی وہ سنگین حقیقتیں ہیں جن سے انسان کے ولولے۔ اُس کا پیارا اور اس کے خواب ٹکرا کر چور چور ہو جاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان میں سے دراصل حقیقت کون سی ہے۔ و لمحاتی خواب۔ یا زندگی کی وہ تلخ کامیاں جنہیں عموماً حقیقت کہا جاتا ہے خیال اپنا اپنا ہے۔ چنانچہ میں ان خوابوں ہی کو حقیقت سمجھتا ہوں۔ میری نظروں میں زندگی کی تمام مشکلات اور تلخ کامیاں درحقیقت۔ یا صحت کا درجہ رکھتی ہیں۔ جن کا صلہ ہمیں ان چند لمحوں میں ملتا ہے۔ جو سنہرے خوابوں سے ملنے ہوئے ہیں۔ آخر ان خوابوں کو محض خیال غلط ” کا نام دے کر اُن سے حاصل ہونے والے کیف و سرور کو کیوں بے معنی بنا دیا جائے۔ کیوں نہ اُسی کو حقیقت

مان لیا جائے۔ ورنہ یوں دیکھئے — تو یہ دنیا۔ یہ زندگی۔ یہ انسان۔ یہ پریم۔ یہ سب کچھ بھی تو آخر خواب ہی ہے۔

ملاح پھر مٹنہ میں کچھ لنگنہ رہا ہے۔ کنائے کے مکالوں سے روشنیوں کا عکس دریا میں لہرا رہا ہے۔ کنائے کے مندوں میں گھٹنے بجنے شروع ہو گئے ہر اندھیرے اور دھند کے باعث نظر نہ آنے والے پنکٹوں سے چوڑیوں اور چھاپوں کے فروس گوش چھپائے سنائی دے رہے ہیں۔ لیکن آخر یہ لہریں کیوں بڑھ رہی ہیں۔ میری کشتی کو انہوں نے چاروں جانب سے گھیر لیا ہے۔ اب تو بیٹھنا بھی محال ہو رہا ہے۔ دریا کی سطح پر سکون ہے۔ پھر میری کشتی کے ارد گرد ہی یہ اضطراب کیوں۔ موجیں اس طرح اٹھ رہی ہیں۔ گویا دہان آب سے سینکڑوں زبانیں لگی ہوئی ہیں۔ کیا یہ کوئی پیغام کہہ رہی ہیں۔ کس کا پیغام — شاید یہ اُسی نالہ کا پانی ہے۔ جو اُس ساٹھ میل فُور واقعہ درو میں سے آتا ہے۔ جس کے کنائے ایک پن بجلی میں وہ ”گاؤں والوں کا آٹا پسیا کرتی ہے۔ تو کیا اُسی نے بہنے والے نالے کو یہ کہا تھا: تم اُسی شہر میں سے گزرتے ہو۔ جہاں وہ ”رہتے ہیں۔ کبھی ان سے مل بھیڑ ہو جائے۔ تو کیا میرا سندیس نہ دو گے —؟ اگر تم سے نشانی مانگیں۔ تو یہ دکھا دینا — اور اُس نے دو آنسو نالے میں ٹپکا دیئے ہوئے اُسے شاید ان دو قطروں کی اس طاقت کا علم نہ تھا۔ کہ وہ سائے کے سائے دریا کو مضطرب کر کے ”کسی“ کی کشتی کو ڈالنا ڈول کر سکتے ہیں۔

آہ وہ بھی کون سادہ تھا۔ جب میرے دوست اُس درے میں مجھے
 گلیا چھوڑ آئے۔ گوپال واس بار بار ہمت توڑ رہا تھا۔ بس بھاٹی میں ٹھک گیا
 ہوں۔ اب اور آگے نہیں۔ اور مجھے سخت غصہ آ رہا تھا۔ کہ یہ جھگڑا۔ برف سے
 ڈھکے ہوئے پہاڑ۔ برف بڑے بڑے پتھر جن سے سر ٹکنا ہوا دودھیا پانی آنے
 حصوں میں بٹ گیا تھا۔ کہ اس پہاڑی نالے کا پاٹ کسی بڑے دریا سے کم
 نہ ہو گا۔ اور پھر ایسی فضا میں کوئی کہے کہ میں تھک گیا ہوں۔ اسکے لئے میرے
 پاس "تبدیق کارلین" سے بہتر کوئی خطاب نہ تھا۔ بالآخر ایک جگہ سب بیٹھ گئے
 لیکن میں پتھروں سے کھینٹا ہوا اور اُن پر سے پھاندا ہوا دھیرے دھیرے
 نالے کو پار کرنے لگا۔ اچانک مڑ کر دیکھا۔ تو سب کے سب واپس لوٹنے کی تیاری
 کر رہے تھے۔ مرزا شفیق اس خلاف تہذیب طریقہ کے خلاف احتجاج کر رہا تھا
 لیکن وہ سب اُسے گھسیٹے جا رہے تھے۔ میاں۔ اُس چلے شاعر کا کیا ٹھکانہ۔
 جی چاہے۔ تو اُسی پتھر پر بیٹھا بیٹھا سا بھج کر دے۔ آخر وہ چلے گئے لیکن نالے
 کی مختلف شاخوں نے میرے پاؤں میں کچھ ایسی زنجیر ڈالی کہ میں وہیں رہ گیا۔
 ————— رفتہ رفتہ پار ہوا۔ قریب ہی ایک پن چکی کی "گرگر گر" سنائی
 دے رہی تھی۔ میں غبٹس کے ماسے اندر چلا گیا۔ چھوٹی سی مٹی کی جھونپڑی
 تھی۔ کسی کی موجودگی سے بے نیاز میں پانی کی گرتی ہوئی آبشار کو بہت دیر
 تک دیکھتا رہا۔ اچانک نظر اٹھا کر چکی کی جانب دیکھا۔ ————— تو "اس" پر
 نظر پڑی۔ وہ اپنی زنگیں ایسی آنکھوں سے ایک پردہ سی "کی جانب دیکھ رہی
 تھی۔ ان آنکھوں سے خدا جانے شہد لی نہ رہی تھی۔ یا نہ رہا۔ —————

بہر حال مجھے وقتی طور پر ایسا محسوس ہوا۔ گو یا جنت میں پہنچا دیا گیا ہوں میرے لئے بن چکی کا اور کچھ دیکھنا باقی نہ رہ گیا۔ میں اس کے عین متقابل چکی کی دوسری جانب کھڑا ہو گیا۔ لکڑی کے ڈنڈوں کے ساتھ اس طرح لگ کر کہ اُس کے قریب تر ہو سکوں۔ مجھے اس بات کا خیال تک نہ رہا کہ میرے چسٹر پر آٹا لپٹ رہا ہے۔ میں اس کے چہرہ پر نظر بس گاڑے کھڑا رہا۔ اس نے شہرہ مار کر نظر بس جھکا لیں۔ اور اپنے کپڑوں پر جما ہوا آٹا جھاڑنے لگ گئی۔

خوش قسمتی سے وہاں کوئی دوسرا نہ تھا۔ لیکن اگر ہوتا بھی۔ تو اس وقت مجھے اس بات کا قطعاً کوئی دھیان نہ تھا۔ میں اُس کیپٹر میں کھلے ہوئے کنول کی جانب دیکھ جا رہا تھا۔ اور بس۔ اُس نے ایک بار نظریں اٹھا کر پھر میری جانب دیکھا۔ لیکن مجھے اس طرح دیکھتے دیکھ کر پھر گردن جھکالی آخر میرا رخار ٹوٹا۔ میں نے پہل کرتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ چکی نہ ہادی ہے؟“ اس نے اسی طرح چکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جی۔“ میں نے پھر ادھر ادھر کی باتیں پوچھیں۔ ”لیکن جی“ اور ”ہاں“ کے سوا کوئی جواب نہ ملا۔ پھر میں نے پوچھا۔ ”نہارا نام کیا ہے؟“ ”ساحب“ میں نے جھٹ نفہرہ جوڑ دیا۔ ”مہم صاحب“ اُس نے جلدی سے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا وہ اپنے ہونٹوں پر اس مزاح سے پیدا شدہ مسکراہٹ کو دبانے لگی۔ میں لکھلا کر سنس پڑ۔ وہ جھینپ گئی۔ میں نے پھر پوچھا۔ ”شادی ہو چکی ہے؟“ ”ہاں۔“ ”کوئی بچے میں؟“ ”نہیں۔“

”میں کچھ سوچ میں پڑ گیا۔“ کیا یہ شادی شدہ حبیبہ
 باب پر ویسی سے رومان کا نامک کھیل سکتی ہے۔ نہیں۔۔۔۔۔ تو پھر یہ
 ہنسی کیوں.....؟ شاید عادتاً ہی۔ لیکن نہیں۔ اس کی آنکھوں میں
 پھر وہ ”جھلک“ ہے۔ ایسا کیوں.....؟ اچھا تجربہ کر دیکھو ”مجھے انسانی
 نفسیات کا مطالعہ کرنے کا بے حد شوق ہے۔ کیونکہ میں اپنے افسانوں کی
 بنیاد ہمیشہ مشاہدے پر رکھتا ہوں۔ چنانچہ اس بار میں نے ایک شادی
 شدہ لڑکی کے نفس کا مطالعہ کر کے غرض سے کچھ پیش قدمی کی۔
 چکی کا ایک پرزہ دیکھنے کے بہانے میں اس کے چھپے جا کھڑا ہوا۔ اس
 وہاں سے پہلے کی کوشش نہیں کی۔ بہت نے زور پکڑا۔ میں نے اس کے
 لاندے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور پھٹے ہوئے لباس کے باعث نیم عریان بازوؤں
 اور شانوں پر محبت سے ہاتھ بھرنے لگا۔ اس نے سر نیچے ڈال دیا میرا ہاتھ
 وراز تر ہوتا گیا۔ کہ اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور آہستہ سے باہر جانے لگی۔
 میں نے آگے بڑھ کر اسے روک لیا۔ لیکن اس نے آہستگی سے محض اتنا ہی
 کہا۔۔۔۔۔ ”کھٹھرو۔ میں آتشہ کا پانی بند کر آؤں۔“ میں نے
 اسے راستہ دینے سے پہلے اس کے باریک باریک ہونٹوں پر اپنے
 لب رکھ دیئے۔۔۔۔۔ میں نے دیکھا کہ اسکی آنکھیں جیسے مدھور س سے
 لبریز ہو گئی ہیں۔ اس کے انگ انگ کی اٹھان میں ایک نیکیا پن آگیا۔ اسکی
 کیفیت بیان سے باہر تھی۔ مگر با وہ ایک ندی تھی۔ جو ہوا کے کسی آوارہ
 جھونکے سے مس کرتے ہی لہرا اٹھتی ہے۔ اس کی سطح پر ایک تھر تھری پیدا

ہو جاتی ہے۔ اسی حالت میں میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ اور وہ باہر چل گئی۔

دوسرے ہی لمحہ میرے دل میں خیال اُٹھا۔ مہا وایہ کسی کو بلا لائے
 — آہ۔ انسان بھی کس قدر بدگمان ہوتا ہے۔ میں اُس بوسیدہ تختے
 کی آڑ سے جسے دروازہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ
 وہ اسیلرح خاموشی سے واپس لوٹ آئی۔ چکی پر گرنے والی آبشار
 بند ہو چکی تھی۔

وہ اندر آئی۔ اور چپ چاپ سر جھکا کر جھونپڑی کے وسط میں کھڑی ہو
 گئی۔ مجھے اس کے بوسیدہ لیکن ڈھیلے ڈالے کشمیری فرن کے اندر سے بھی مختلف
 اعضاء کی پھڑک دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنے بازو پھیلا دیئے۔ اور اُس نے
 اپنے تئیں میری گود میں ڈال دیا۔

میں نے اس کی مٹیالی لٹوں کو سلجھاتے ہوئے پوچھا: ”صائب تمہیں
 میں اچھا لگا۔“ اس نے میرے سینے سے لگے لگے ہی میرے فاونٹین پن
 کے کلپ کو انگلی سے صاف کرتے ہوئے کہا: ”میں کیا جانوں۔“
 اُن کا بتاؤں۔ کہ اس جواب میں کس قدر معصومیت تھی۔ اتنی معصومیت سونے
 بجے کی مسکراہٹ میں بھی نہ ہوتی ہوگی۔ میں نے پھر پوچھا: ”تم بھاگ کیوں
 نہ گئیں؟“

”میں کیا جانوں۔“

میرا جذبہ تحقیق و تجسس اور دعوتِ زہد اس معصوم ”میں کیا جانوں“

میں ڈوب گئے ہیں اسکے نفس کی شکست کا مطالعہ کرنے والا تھا۔ لیکن خود اپنی شکست کا سامان کرنے لگا۔ میں نے حسینوں کے جذبات سے کھیننا سیکھا تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کھیل میں کبھی کبھی خود بھی ہار مانتی پڑتی ہے اور اس روز کشمیر کی پہاڑیوں کے ایک سنسان درے میں پھٹے کپڑوں والی ایک دیہاتی لڑکی نے ایک ہی بھولی اداسے ایک کھلنڈے پر دوسی کو لوٹ لیا

بائیں ہمہ اس طرح لٹ جانے پر بھی مجھے اتنا ہوش رہا کہ ایک شادی شدہ عورت کی تشنگی محبت کی وجہ جان سکوں۔ مجھے اُس نے بتایا کہ اُس کی شادی اس شخص سے ہوئی ہے جو آج سے چار سال قبل اسکا چھوٹا بھائی تھا۔ اور کاتی بوڑھا لیکن حیثیت دار ہے۔ اس تحقیق نے میرے اس عقیدہ کو اور بھی پختہ کر دیا کہ عورت بدکار نہیں ہوتی۔ اُسے دولت پرست سماج ہی ایسا بنا دیتا ہے۔

مجھے اپنے دوستوں سے ملنے کی جلدی تھی۔ اس لئے میں اُس سے دوسرے روز آنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔ لیکن تمام راہ مجھے وہ لوگ ملے وہ کپ میں پہنچ چکے تھے۔ اور میں بار بار سوچ رہا تھا کہ کیا یہ سچ تھا مجھے اس واقعہ کی حقیقت پر اعتبار ہی نہ آتا تھا۔ دوستوں سے پچھڑنے کے بعد چند ہی لمحوں میں کیا کچھ ہو گیا۔ یقیناً یہ ایک خواب تھا۔ ویسا ہی خواب جسے دیکھنے کا میرا عادی ہوں۔ جی کہ صبح ہوتے ہوتے مجھے اس بات میں کوئی

شک نہ رہ گیا۔ کہ نالے میں کسی پتھر پر بیٹھے بیٹھے میں نے ایک حسین خواب دیکھا تھا۔ لیکن پھر دل میں یہ کسک کیوں؟ اور میں خود اپنے آپ پر اس بات کے لئے ہنس پڑا۔ کہ خواب میں دیکھی ہوئی حسینہ کو دل سے دیا۔ یہ سب باتیں ہی تھیں۔ اور میں سا بچھ کے لئے بے تاب تھا۔ خواہ یہ خواب ہی تھا۔ لیکن میں پھر وہیں جانا چاہتا تھا۔ جہاں صائب کے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔

سا بچھ ہوئی۔ اور میں پھر اُسی جھونپڑی میں تھا۔ آج اُسے دیکھتے ہی میری آنکھوں کی وہی حالت ہو گئی۔ جو پورے ناستی کا چاند دیکھنے سے ہوتی ہے۔ اس کے چہرے پر آج ایک بھی وجہ نہ تھا۔ وہ شبنم سے دھوئی ہوئی پنکھڑیوں کی طرح پاکیزہ تھا۔ اُس نے اپنے دیہاتی فیشن میں نہایت خوبصورت سے چوٹی گندھوائی تھی۔ بالوں کا رنگ آج مٹیالا نہ تھا۔ بلکہ ان کی چمک سانپ کی آنکھوں کو مات کئے دیتی تھی۔ شاید تمام دن اس نے اپنے چہرے اور بالوں کی کڑی حفاظت کی تھی۔ اُس کا فرن وہی تھا لیکن اُس پر گرد کی موٹی نہ نہ تھی۔

آج چاند تو چودھویں کا تھا ضرور۔ لیکن راس اور ذنب نے اُسے گھر میں لگا رکھا تھا۔ آج اس کے پاس دوبارہ بارہ سالہ لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ جو حیرت سے مجھے تک رہی تھیں۔ میں اس کی گلے کے قریب گیا۔ لیکن اس نے آنکھیں تک اٹھا کر میری جانب نہ دیکھا۔ میں سمجھ گیا۔ کہ یہ اُسی کی کوئی رشتہ دار ہو گئی۔ میں ایک اجنبی کی طرح کچھ دیر ادھر ادھر کی چیزیں دیکھتا رہا۔ اس دوران

میں اس نے پہلے ایک لڑکی کو کسی بہانے باہر بھیجنے کی کوشش کی لیکن اس نے میری جانب اشارہ کیا۔ گویا اس نے کہا۔ ”کہ تمہیں معلوم نہیں۔ یہ پڑا یا مرد یہاں ہے۔ ہم تیری حفاظت کے لئے یہیں بیٹھیں گے۔“

اس نے سر پیٹنک دیا۔ اور پھر اس نے کوئی ”کوشش“ نہ کی۔ گویا ایک نہایت نازک کلی پڑا اس پر لگ گئی۔ میں تھوڑی دیر کے بعد باہر نکلا اور ٹالے کے کنائے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ کہ شاید باہر آئے۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ باہر تو نکلی۔ لیکن آٹے کی پوری سر پر اٹھائے ہوئے۔ یعنی دو گھر واپس جا رہی تھی۔ دروازہ بند کرتے کرتے اُس نے ایک لڑکی کو زور سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”کہ تم نے بہت تنگ کیا ہے۔ کل میں آؤں گی۔ تو تمہیں قطعاً ساتھ نہیں لاؤں گی۔“ گویا اس نے مجھے بالواسطہ طور پر ”کل“ کے لئے دعوت دی۔ لیکن.....

میں دل ہی دل میں سچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ ”اے معصوم حبیبہ کاش تجھے معلوم ہوتا۔ کہ تو کل جس کے انتظار میں صبح سے سا بچھ کر رہے گی۔ وہ یہاں سے سینکڑوں میل دور بیٹھا ہو گا۔ تو سا بچھ کو گھر لوٹتی ہوئی کہے گی۔ ”کہ پردیسی کس کے مدد“ لیکن کاش تو آج بات کرنے کا کوئی موقع پیدا کرتی۔ اور میں تجھے اپنی مجبوری بتاتا۔ گوپال داس کے گھر سے فوراً لوٹ آئے کا تار آ گیا ہے۔ ہم کل نہیں رک سکتے۔ اب بھی وقت ہے۔ راہ میں سے لوٹ آ۔ کوئی بہانہ کر کے۔ کہ میری فلاں شے پن چکی پر رہ گئی ہے لیکن افسوس۔ تو نے ابھی تک مکاری نہیں سیکھی۔“

ماضی کی یاد کے اندھیرے میں سے اجاگر ہوتے چلے جا رہے ہیں جنہیں میں زندگی کی چوڑ کر دینے والی کلفتوں کا واحد خوشگوار ماحصل سمجھتا ہوں۔ وہ لمحے جب کسی دو پٹے کے خمیرین رنگ نے ہمارے دل کو خون کر دیا۔ جب کسی کے مسکراتے ہوئے تیکھے لبوں نے ہمیں چہرہ لگا یا جب کسی نے ہنسنے ہنسنے ہم سے دو باتیں کیں۔ اور ہمارے دامن کو سدا بہار پھولوں سے بھر دیا۔ یا جب کسی نے جھکی ہوئی شرمیلی آنکھوں سے کچھ اس طرح دیکھا۔ گویا ایک تیرنیم کش چھوڑا ہو۔ یعنی وہ چند لمحے جو ہمیں اس بات کا یقین دلاتے ہیں۔ کہ جو رنگین خواب ہم نیم خوابی کی حالت میں دیکھا کرتے ہیں۔ وہ محض سراب نہیں۔ بلکہ کبھی کبھی حقیقت کی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ گو یہ لمحے انسان کی زندگی میں خال خال آتے ہیں۔ بائیں ہمارا نکاسلسلہ لانا ہی ہے۔ کیونکہ ایسے لمحے ہر ایک شخص کی زندگی کے طویل اندھیارے میں کہیں کہیں ایک ابدی روشنی کی مانند نور افشاں ہیں۔ چنانچہ ان رنگین روشنیوں کا سلسلہ بھی بہت دراز ہے۔ اس جہلم کی طرح۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ جہلم تو بحیرہ عربیہ ملکہ اپنی تکمیل کر لیتا ہے۔ لیکن ان رنگین خواب نامحقیقتوں کا بیان ہمیشہ تشنہ تکمیل ہے گا۔

فتح مکہ کی محرابیں زیادہ واضح ہوتی جا رہی ہیں۔ اور مجھے وہ واقعہ یاد آ رہا ہے۔ جس کی تشبیہ اس پازیب کی جھنکار سے دی جاسکتی ہے جو پردے کے پیچھے کسی حسینہ کے نازک پاؤں میں چھنک ہی ہو جسکی محض آواز ہی

اس کی ناز خرامی اور چال کی لٹک کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

میرا کمپ ایک پہاڑ کی چوٹی پر لٹکا ہوا تھا۔ اس جگہ دو ہی چار کمپ اوٹھتے۔ ایک میں ایک ایگلو انڈین عورت تھی جس کا نام تو تھا "لی"۔ لیکن شکل نرگس ایسی نہ تھی۔ گویا ایسی ہی بات تھی جس طرح ہم "سیا ہی" کو روشنائی کہتے ہیں۔ اردو میں اُسے کافی مہارت تھی۔ بلکہ ادب سے بھی کچھ کچھ لگاؤ تھا۔ بدیں وجہ ہمارے میل ملاقات بھی تھی۔ وہ مجھ سے کتا ہیں بھی پڑھنے کے لئے لے جاتی تھی۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ آپ کا فلاں ڈراما اُس کمپ میں پہننے والی لڑکی لے گئی ہے۔ دو ایک دن میں مل جائیگا۔ میں نے کہہ دیا "کوئی ہرج نہیں" میں نے اس لڑکی کو دیکھا تو نہیں تھا۔ لیکن جانتا ضرور تھا۔ وہ ہندو سرکار کے کسی بہت بڑے افسر کی نور چشم تھی۔ اور تفریح کی غرض سے وہاں آئی تھی۔ میں عموماً ان کے کمپ کے پچھواڑے ہی صبح شام ٹہلنے جاتا تھا۔ کیوں کہ وہاں سے دور نیچے تک داوی کا منظر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ ایک روز میں وہاں ٹہل رہا تھا کہ کمپ ایک ماما نکلی۔ اور میرے قریب آکر بولی "بالو جی یہ کتاب آپ کی ہے۔" "جی ہاں۔" "تو بی بی جی کہتی ہیں کہ ہم اسے ایک دو روز تک اپنے پاس رکھ سکتی ہیں" میں نے رسمی طور پر کہہ دیا۔ "بڑے شوق سے۔ بلکہ اگر انہیں شوق ہو تو میرے پاس اور بھی کتب ہیں۔"

ماما دعا میں دیتی ہوئی چلی گئی۔ اور میں یہ سوچتا رہ گیا کہ "آخر یہ معاملہ

کیا ہے۔ مجھ سے "بی بی جی" کو پوچھنے کی ضرورت کیوں؟ میں نے ملی سے کب تقاضا کیا تھا۔ مجھے وال میں کچھ کالا نظر آنے لگا۔ اور اس وقت تو مجھے کوئی شک نہ رہا۔ جب وہ کتاب واپس آئی۔ اس میں ایک پرچہ اُن کے دستِ مبارک سے لکھا ہوا پڑا تھا۔ میں نے آپ کی کتاب کو ایک بھی داغ نہیں لگنے دیا۔ کیوں ہے نہ۔ اس جانب سے اس ملکی سی شوخی نے میری ہمت بڑھائی۔

دوسرے ہی روز ماما کے ذریعہ مزید کتب کا مطالبہ آیا۔ میں نے اپنے ہی افسانوں کی ایک کتاب بھیج دی۔ جس کے ساتھ ایک نامہ بھی تھا۔ جس میں اُن کی پہلی مہربانی کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ اور اس کتاب پر تنقید کرنے کو کہا تھا۔

جواب میں انہوں نے لکھا۔ میں ادبی دنیا سے واقف ہوں اور تنقید سے قاصر۔ علاوہ ازیں میں مذاہب کی دلداد ہوں۔ لیکن آپ کی یہ کوشش ہے۔ کہ آپ کے افسانے پڑھ کر کوئی بھی آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے۔ بہر حال میں اس بات سے خوش ہوں۔ کہ آپ دوسرے افسانہ نگاروں کی مانند اظہارِ محبت کے واہیاتِ منظر پیش نہیں کرتے۔

میں نے جواب دیا "آپ کا تنقید سے گریز واجب نہیں۔ ادبی دنیا سے آپ کی بے تعلقی میرے حق پر وال ہے۔ کیونکہ ادبی دنیا سے واقف لوگ بعض مرتبہ افسانہ نگار کے نام ہی سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔

یا پھر منہ دیکھے کی ستائش ہوتی ہے۔ اور یہاں تو میں بدقسمتی سے اس رُخ پس پردہ سے قطعاً نا آشنا ہوں۔ اس لئے آپ کی تنقید بے لاگ ہوگی۔ اور مجھے اپنی حقیقی پوزیشن کا تعین کرنے میں آسانی ہے گی۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں۔ کہ میرا اپنا معیار یہ ہے۔ کہ ایک افسانہ پڑھنے کے بعد کم از کم چند ساعت تک تو آپ میں یہ سکت باقی نہ رہے۔ کہ آپ ودق پلٹ کر اگلا مضمون شروع کر دیں۔ آپ کی زبان سے بے ساختہ ”آہ“ یا ”واہ“ نکلا جائے۔ ٹریجیڈی ہو تو آپ ایک لمبی سانس کھینچ کر رہ جائیں۔ تو سمجھ لیجئے۔ کہ افسانہ نگار کامیاب ہے۔ اس کا مقصد اسی وقت

پورا ہو جاتا ہے۔“

اما کے ہاتھ جواب پہنچا۔ ہم نے افسانہ نگار کے نام سے رعب تو کھا لیا۔ لیکن پھر بھی میں آپ کے منہ دیکھے کی ستائش تک نہ کر سکوں گی۔ ہاں۔ آپ کے افسانے پڑھ کر میں نے لمبی سانس تو کھینچی تھی۔ منہ سے آہ بھی نکلی تھی۔ شاید مجبوراً ہی ایسا ہوا ہو۔“

میں نے جواب لکھا۔ ”میرا کھڑا کون سا چاند کا ٹکڑا ہے جسے دیکھ کر کوئی لازماً میری ستائش ہی کرے۔ اور یوں بھی نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا۔ رہا افسانہ نگار کے نام سے رعب کھانا۔ سو شاید اسی رعب کے نام سے آپ کو آج تک اُس سے آنکھیں چا کر کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔“

————— اچانک شکارہ کنارہ سے ٹکراتا ہے۔ ملاح کہہ رہا ہے ”بیچے بابو جی
 زینہ کدل کا پل آگیا۔“ کنائے والے مکان کے باہر روشن قمقموں سے بنے
 ہوئے عروں ہیں دینا ناتھ چوڑا اینٹ بڑا درز ”چمک رہا ہے۔ اور میں اب بھی
 سوچ رہا ہوں۔ کہ“ اس دارا خلافت کشمیر سے ساٹھ میل دور اس کونے میں
 پہاڑیوں کے درمیان جو نالہ بہتا ہے۔ اسکے کنارے ایک پن چکی میں بیٹھی ہوئی
 ایک الٹھ دیہانی حسینہ کیا اب بھی ایک پردہ سی کی منتظر ہے؟ اور کیا ابھی تک
 اس کی زندگی کا ایک رومانی افسانہ ”تشنہ تکمیل“ ہے۔—————؟

سری نگر نغمہ نمبر ۱۹۴۱ء

کلاک

”دفتر میں کام کے اوقات کیا ہوں گے۔“
 ”صبح نو بجے سے چھ بجے شام تک۔“

ایک سال پہلے کا اپنا سوال اور رائے بہادر کا وہ جواب اس کے کانوں میں اس طرح گونج رہا تھا۔ جیسے ابھی ابھی کہا گیا ہو۔ اُس نے آنکھ اٹھا کر دفتر کی کلاک کی طرف دیکھا۔ جس نے ابھی ٹن ٹن کر کے سات بجائے تھے۔ کلاک پر ستر پل ہا تھا۔ سات بج کر رُک نہیں گیا تھا۔ پھر وہ — کیوں ک جاٹے۔ یو پشیر اس سے کہ اس کی نظریں سو س کلاک سے میز پر منتقل ہوئیں۔ اس کا قلم دوات سے یا ہی لیکر سامنے پڑی فائل کے کھلے صفحہ پر چلنے لگا۔

کلاک کی ایک آواز نے شنکر میں جو مستعدی پیدا کر دی تھی۔ دوسری آواز نے اُسے فزاء کر دیا۔ ساڑھے سات بجے کی "ٹن" ہوئی۔ اور شنکر کا فلم پھر رُک گیا۔

اس نے نوجوانی ہی میں نیم سفید ہو جانے والا سراٹھا کر نہ کُنے والے کلاک کی جانب اور پھر اپنے سامنے پڑے ہوئے کاغذوں اور فائیلوں کے انبار کی جانب دیکھا۔ ابھی بہت کام باقی تھا۔ لیکن یہ ختم کب ہو گا؟ یہ اُسے بہار کے دفتر کا کام جو اُنکے کرایہ داروں سے کرائے وصول کرنے کے لئے مفرد لے لٹرنے سے لے کر گھر میں آنے والے اُپلوں کو گنتے تک پھیلنا پڑا تھا۔

آج اُسے چند دوستوں کے ساتھ سات بجے سینما دیکھنے جانا تھا۔

لیکن یہ کام
اس کی گہرے بھوسے رنگ کی بڑی بڑی آنکھوں میں سُرخ پھیل گئی
اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور کرسی کی پشت پر اپنا بوجھ ڈال کر جیسے کچھ سوچنے لگا۔

لیکن کلاک نہیں رُکا تھا۔ اور اس کا کام

دن کی روشنی اور رات کے اندھیرے نے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اُن کے آخری قہقہے نے دُور اُفق پر ایک سُرخ رنگ کے چمکتے ہوئے بادل کی صورت اختیار کر لی۔ باہر ٹرک پر سیر کرنے والے دوستوں کی ٹولیاں اور اُنکے قہقہے۔ موٹروں اور ٹانگیوں کے شور و شغب تھا

اول تو کام ہی ساڑھے سات اکٹھ بجے سے پہلے ختم نہ ہو پاتا۔ اور اگر مو بھی جائے تو اتنی دیر میں رائے بہادر ٹینس کھیل کر واپس آچکے ہوتے۔ اور اپنی ننگان تارنے کے لئے محض اس غرض سے دفتر میں بیٹھ جاتے۔ کہ انکے دو تین کلرک انکے سامنے نیم دائرے کی صورت دست بستہ کھڑے رہیں۔ اور آنجناب اپنی بے معنی اور بد ذوقی کی حامل باتیں سناتے رہیں۔

رائے بہادر شاید اسی میں راحت محسوس کرتے تھے۔ کہ جب تک وہ رات کا کھانا کھا کر لستر پر واز نہ ہو جائیں۔ انکے کلرک دفتر کی رونق بڑھاتے ہیں شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی ملاقاتی کسی وقت بھی آجائے۔ تو اُس پر رائے بہادر کی عظمت کا ویسا ہی اثر پڑے جیسا بیلی رام برادرز کی ہم گھنٹہ سروس کا انکے گاہکوں پر۔ انکے دل میں کئی باریہ خیال آجاتھا۔ کہ کلرکوں کے ہوتے رات کو چوکیدار کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن کلرکوں کو ناجائز تکلیف دینے کے خلاف انکا ضمیر بجاوت کر دیتا تھا۔ جہاں ناجائز تکلیف دینا انہیں گوارا نہ تھا۔ ہاں انہیں ناجائز رعایت دینا بھی پسند نہ تھا۔ چنانچہ ان کے ہاں ہفتہ وار۔ ماہوار یا سالانہ تعطیل کا کوئی ریکارڈ موجود نہ تھا۔ ہاں اگر کلرک کا کوئی قریبی رشتہ دار مر جائے۔ تو رائے بہادر اپنا اصول توڑ لینے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔

یہ سب کچھ سوچتے سوچتے تشکر کی آنکھوں کے سامنے رائے بہادر کی شکل پھر گئی..... ایک کروہ شکر..... جس پر حرص و طمع کی سیبا ہی بنتی ہوئی تھی۔ جس کے تھقبے کی آواز کئی مفلسوں کی سوکھی ہڈیوں کے چرچرانے سے مزید

نہی۔ جس کے گالوں کی سرخی اس کے کاشتکاروں کی آنکھوں سے بہنے والے خون سے مستعار تھی۔

جس کی پیشانی پر انسانیت کا ایک بھی خط نہ تھا۔ لیکن جسے خدا کی ایک غمش نے سینکڑوں انسانوں کا مرجع بنا رکھا تھا۔

انسانیت..... انسانیت کے لئے رحم و انصاف لازمی ہیں اور وہ ان سے کورا ہے۔ اسی لئے.....

لیکن کیا ہم ہیں انسانیت ہے؟
انسانیت کبھی شیطنت کے آگے سرخم نہیں کرتی۔ پھر ہم.....
ہم جو دن میں کئی کئی مرتبہ اس کے سامنے گڑ گڑاتے ہیں کیا ہم انسان ہیں؟ جو اسکے ہر روا و نار و اکو چپ چاپ برداشت کرتے ہیں۔ ہم سے وہ بہتر ہے۔ اگر شیطان ہی ہے تو بھی ایک فاتح ہے۔
تو رطخ..... بشکر کے ہاتھ میں قلم جانے کس جوش کے زیر اثر ٹوٹ چکا تھا۔

شکر کے سامنے والی میز پر بیٹھے ہوئے بوڑھے امین چند نے اپنے دادا کے وقت کی عینک کو جس کی ایک کمانی ابھی تک صحیح سلامت تھی۔ ناک کی گھڑی سے ایک لمحہ کے لئے اٹھا کر اس چھوکرے کی جانب کچھ عجیب و غریب دیکھ کر کہا۔
شکر کیا سوچ رہے ہو؟ تمہارا کام کب ختم ہوگا؟
اس نے بوڑھے کی جانب دیکھا۔ جس کی بامعنی نگاہیں پکار پکار کر کہہ

مہی نہیں ۔

”چھو کرے۔ تم کس جھنجٹ میں پھنس گئے ہو۔ یہاں اس دنیا میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ یہاں فاسخ کا قانون ہی انسانیت اور انصاف کہلاتا ہے۔ یہ نیا ہے۔۔۔۔۔ جفاقی کی، تمہاری شاعری اور اقنوعات کی نہیں۔۔۔۔۔ تم شاعر مزاج ہو۔۔۔۔۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔۔۔۔۔“

فشکر اُس نگاہ طائر کی تاب نہ لاسکا۔ اپنے سامنے پڑے کاغذوں کے انبار کی جانب دیکھنے لگا۔ اور میز پر پڑے ہوئے ہر کاغذ پر جلی سُرٹ میں لکھا تھا۔

”تم شاعر مزاج ہو۔ احساسات کو زندہ رکھنے والے۔۔۔۔۔ اور اس دنیا میں آٹے ہو شاعری کرنے۔۔۔۔۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ اُس نے سر دھن لیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن کانوں میں کوئی کہہ رہا تھا۔

”راٹے بہاؤ کا کلرک اور پھر اس قدر حساس۔۔۔۔۔ او۔ ہو۔ ہو۔ ہو۔ ہو۔ اُس نے کانوں میں بھی انگلیاں دے لیں۔

کیا ایک کلرک کے لئے حساس ہونا گناہ ہے۔ کیا اُسے ایک زندہ لاش بن جانا چاہیئے۔ ایک لاش جسے سہاٹی برساتوں کی گھٹنگھڑاؤ اور سرمئی گھٹاٹیں پسندتے نیسے پیسے اور اووے پتنگ۔ ہوئی کی زبان پاشیاں۔ کسی بڑے نیو ہار کے دن بیوی بچوں کا میلہ دیکھنے پر اصرار۔ یہ سب کچھ جسے اُس دفتری قبر سے باہر نہ نکال سکے۔۔۔۔۔ ایک لاش۔۔۔۔۔ جس کا جسم تو زندہ ہو لیکن احساس مرہ ہو چکا ہو۔

میں ایسی کمر کی سے باز آیا۔ اگر شادی کی جائے۔ تو بیوی کو گھر کی چار دیواری
میں جس بیجا میں کیوں رکھا جائے؟ آخر نوکری کی غائبیت یہی ہے تاکہ خالی اوقات
میں عیش سے زندگی بسر کی جائے خالی اوقات یہ خالی وقت کب ملے
گا.....؟ آخر یہ کام کب ختم ہوگا؟

اس نے سامنے بیٹھے ہوئے میں چند کی جانب دیکھا۔ وہ بوڑھا بوچھا
ہے۔ اُسے بیوی کے احساسات یا عیش سے کیا۔ لیکن بہاری لال تو ابھی پچیس
ساں سے زیادہ کا نہیں۔ اُس کی بیوی بھی خیر سے ابھی جوان ہی ہے۔ تو پھر
اسکے احساس کو کیا ہو گیا ہے۔

اُس نے بہاری لال کی جانب دیکھا۔ جس نے نیلے رنگ کے رجبڑی خانہ
پڑی کرتے ہوئے اچانک سر اٹھایا۔ لمحہ بھر کے لئے اُس کی جانب دیکھا۔ اور پھر
اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ لیکن اس ایک ہی لمحے میں اسکی نگاہیں شکر کو
جواب دے گئیں۔

”تم کیا بانو؟ بھولے نوجوان۔۔۔۔۔! تمہارے تصورات کی بہرہ بھی
نک دنیاوی حقیقت کی کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش نہیں ہوئی۔ ورنہ تم
ایسا نہ سوچتے۔ ہمارے احساسات کی رکھ میں سے اب بھی کبھی بھولے بھگے کوئی
شرعہ تڑپ اٹھا ہے۔ کبھی کبھی ہمارے دماغوں میں بھی زلزلے کے چند جھٹکے محسوس
ہوتے ہیں۔ لیکن ان سب کی شدت اُس گہرائی تک نہیں پہنچتی۔ جو بیوی بچوں
کا پیٹ بھرنے کے خیال میں ہے۔ لیکن تم خالی کیوں بیٹھے ہو۔ تمہارا
کام کب ختم ہوگا۔۔۔۔۔؟“

شکر کی نگاہیں پھر جھک گئیں۔ سامنے فائیلوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ نیچے سڑک پر ایک سائیکل سوار گھنٹی بجاتا ہوا جابرا ہوا تھا۔ گھنٹی کی آواز سے اسکی تیز رفتاری کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اُسے گھر جانے کی جلدی ہے۔ شاید گھر بیوی انتظار کر رہی ہوگی۔ اس کے بچے تو اب تک سوچکے ہوں گے۔ اور کیا جانے بیوی بھی اونٹن پر ہی ہو۔ کھانا پر دسٹے کے لئے کئی مرتبہ سرپوش کھولا ہوگا۔ لیکن اس کا غاؤ تو جلدی کیسے آجائے۔ آخر دفتر و فتر ہی ہے۔ گو پیٹ پالنے ہی کے لئے دفتر جانا ہوتا ہے۔ لیکن دفتر کا کام۔۔۔۔۔ اس کے مقابلہ پر پیٹ بھرنا مقدم نہیں ہو سکتا۔

بھاری لال کی بیوی بھی تو منتظر ہوگی۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ میری ہونے والی بیوی۔۔۔۔۔
لیکن یہ کام کب ختم ہوگا۔۔۔۔۔؟ یہ راتے بھاد کے دفتر کا کام۔۔۔۔۔

دفتر سے باہر نکلتے وقت کوٹھی میں ایک موٹر داخل ہوئی شکر نے دیکھنے کی کوشش کی کہ اسپین کون بیٹھا ہے۔ لیکن سامنے کی تیز رفتاریوں نے نگاہیں کھینچ کر دی تھیں۔ شکر بھاگ پڑا کہ کسی کے اونچی اڑتی والے بوٹوں کی ٹھپ۔ ٹھپ۔ گول کرے میں سنائی دے رہی تھی۔ اور ہوا کا کوئی آوارہ جھونکا اس کے لبوں سے نکلنے والے گیت کے چند بول شکر تک پہنچا گیا۔

”ندی کنائے کھڑی ہوں ساجن
تیرے ملن کی مانی۔۔۔۔۔“

مالک کی نوکری نہیں وہ یہ ملازمت نہیں کریگا۔ یہاں اس کے
تصورات کی دنیا آباد نہیں ہو سکتی۔، لیکن آج رانی نے اس کا خیال
پھر بدل دیا، اس نے مجھے آپ کہہ کر بلا یا ہے۔ آپ — کتنی خوش
سیرت ہے، اس کی پیشانی باپ کی طرح شکن آلود نہیں اس کے مسکراہٹ
میں کھلے ہوئے لب شاید غصہ کے مارے پھڑکتا نہیں جانتے —
وہ صرف مسکرا جانتے ہیں۔ اور پھر ان کے صحن میں کھلے
ہوئے پھول۔

یقیناً اس کو ٹھپی میں حسین اور رحمدل انسان بھی رہتے ہیں جو کلرول
کو "آپ" کہہ کر بھی پکار سکتے ہیں۔ اور ان سے ہنس ہنسکر باتیں کر سکتے ہیں۔
اس کو ٹھپی میں اچھے آدمی بھی بستے ہیں۔ مسکراتے چہروں والے۔ اور پھر کو ٹھپی کے
صحن میں کھلے ہوئے پھول۔
وہ بھی اپنے آئین کے لئے ضرور شگفتہ پھولوں کا ایک
پودا لائے گا۔

چند ہی روز کے بعد وہ کہیں سے گلاب کی ایک قلم لے آیا۔ انہی دنوں
اس کی ماں نے شکر کے لئے ایک خوبصورت لڑکی کا رشتہ ڈھونڈ نکالا۔
منگنی ہو گئی۔ ماں شادی کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ شکر نے گلاب کی جو قلم
لگا ٹی تھی۔ اس میں ایک کو نپل پھوٹ پڑی تھی۔

اچانک شکر کو ٹھوکر لگی۔ اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ سامنے موتی

محل سینما میں روشنیاں دھڑ دھڑا جلی رہی تھیں۔ اُسے پھر بہت دیر ہو جانے کا احساس ہوا۔ اسکی بوڑھی ماں کو کتنی تکلیف ہونی ہوگی جو بیٹے کے انتظار میں سو بھی نہیں سکتی۔ ایسی ملازمت بھی کیا ہوتی۔

سامنے سینما کے باہر ایک انگریزی رنگ کی کار کھڑی تھی جس میں ایک ڈرائیور بیٹھا بیٹھا اوتھڑھار ہاتھ تھا۔ آخر یہ بیچا رہا بھی تو ملازمت ہی کرتا ہے نا؟ اسکی زندگی کھڑک سے بھی بدتر ہے۔ کیا جانے اسے کب چھٹی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ مالک سینما سے نکلے تو کسی شراب خانے میں جا بیٹھے۔ اس بیچاے کی بھی بیوی ہو گی۔ وہ تو یقیناً انتظار نہیں کرتی ہوگی۔ کیونکہ ہر انتہا میں سکون ہوتا ہے لیکن یہ تو لالہ کشوری لال کی کار ہے۔ سنا ہے کہ اُسے سرمایہ داری کی سخت چھوٹ تک نہیں گئی۔ اپنے ملازموں کا بہت خیال رکھتا ہے۔ ہو گا۔ آخر سرمایہ داروں میں اچھے لوگ بھی تو ہوتے ہیں۔ یہ ضرور خوبصورت ہو گا۔ جیسی اچھی سیرت رکھتا ہے۔ رانی بھی تو خوبصورت ہے نا؟ وہ مسکراتا ہوا چہرہ اور اسکے صحن میں وہ کھلے ہوئے پھول۔ میرے پودے کی کوپل بھی اب کلی بن چکی ہوگی۔ بس پہلے ہی دن اُسے دیکھا تھا۔ جب وہ پھوٹ رہی تھی۔ اور دھڑکی دن سے دفتر جلدی جانا ہوتا ہے۔ اور دیو سے آنا پڑتا ہے۔ اسے دیکھنے کی فرصت ہی نہیں۔ رانی کو بھی تو اس دن کے بعد سے نہیں دیکھا۔ وہ اُس روز مسکرائے ہی جا رہی تھی۔ شاید وہ ہر وقت مسکراتی رہتی ہے۔ کیا اسلئے کہ اسکے صحن میں پھول ہر وقت کھلے پتے ہیں۔ لیکن اگر وہ دفتر کے کدکوں کی ابترا حالت دیکھے کیا پھر بھی اسی طرح مسکراتی ہے۔ لیکن نہیں اُس سے یہ توقع فصول ہے

ابھی کل ہی رُلدور سوٹیا سنار ہا تھا۔ کہ چھوٹی بی بی نے اُسے بریت مارا۔ وہ
 بوڑھا بیچارا — وہ کہتا ہے۔ اُسے کبھی ہنستے نہیں دیکھا۔ تو کیا وہ صرف
 نوجوانوں ہی سے مسکرا کر باتیں کرتی ہے۔ اور آپ کہہ کر بلاتی ہے۔ پھر اُسے کیا
 سمجھا جائے۔ انصاف پروری یا نفس پروری.....

شکر کے سامنے اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ سینما کی چکا چوندی روشنی بہت
 پیچھے رہ گئی تھیں۔ سامنے میونسپلٹی کی مہربانی سے اندھیرے کے سوا کچھ نظر
 نہ آتا تھا۔

بوڑھے میں چند نے اپنے دادا کے وقت کی عینک کو جیبکی ایک کمائی
 ابھی تک صبح سلامت تھی۔ ناک کی گھوڑی سے ایک لمحہ کے لئے اٹھا کر اُس کی
 جانب کچھ عجیب ڈھنگ سے دیکھ کر کہا۔

”شکر تم ابھی بچے ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ رائے بہادر نے تمہیں جو
 برطرف کر دیا ہے۔ تو انکی مراد حقیقت یہ نہیں۔ بلکہ وہ تمہیں مایوسی کے
 ڈراؤنے اندھیرے میں دھکیل کر اس بات کا احساس کرا دینا چاہتے ہیں کہ
 ایسی غلطیوں کا انجام کیا ہو سکتا ہے تاکہ تم آئندہ غلطی کے خوف سے لڑتے
 رہو۔ جاؤ دو تین مرتبہ گڑ گڑاؤ گے۔ تو ڈانٹ ڈپٹ ہی میں معاملہ نیٹ جا۔

رائی نے کرحت آواز میں پھر پوچھا ۔

”کیا کام ہے —————؟“

”کچھ تھوڑا سا —————“

”کچھ تھوڑا سا کے لگتے تمہیں پتہ نہیں کہ یہ وقت انکے آرام کرنے کا ہے ۔

انہیں تھوڑی دیر تو چین کی سانس لینے دیا کرو ۔ چلے آتے ہو منہ اٹھا گئے —————“

شکر نے جواب نہیں دیا ۔ چپ چاپ واپس آ گیا ۔ ایک سفید رنگ کا خوشنما

پھول اُسے کو بڑھا ہوا تھا ۔ اُس نے اُسے توڑ لیا ۔ اور پھر مسل کے پھینک دیا ۔ اس

میں اُسے کسی کے خون کی رنگت دکھائی دے رہی تھی ۔ سفید ————— خوشنما

اسکے قریبی برآمدے سے رائی اور وہ نوجوان ہنستے ہوئے گزر گئے ۔ صحن میں

لگے ہوئے پھول کھلے ہوئے تھے ۔

پرلی کیا ۔ می میں مالی مرجھائے ہوئے پھولوں کے پودے اکھاڑ اکھاڑ کر دم

پھینک رہا تھا ۔ شکر کو ٹھٹی سے باہر نکل گیا ۔

”وہ اب معافی مانگنے نہیں آئیگا ۔ نہیں ۔ وہ اب یہ ملازمت نہیں کریگا ۔

ایسے بد سیرت مالک کی نوکری ۔ جس میں انسانیت نام کو نہیں نہیں یہاں

اسکا جذبہ انسانیت بغاوت کرتا ہے ۔ یہاں اسکے قصورات کی دنیا آباد نہیں

ہو سکتی ۔ وہ کچھ اور کرے گا ۔ اگر ملازمت ہی کرنا ہے ۔ تو کسی اور جگہ ڈھونڈ لیگا

سربراہ داروں میں کئی اچھے لوگ بھی تو ہوتے ہیں ۔ لالہ کشوری لال بھی تو سربراہ

ہے ۔

”ہماری راہ سے ہٹ جاؤ۔ نہیں تو کچلے جاؤ گے۔“ ایک بار تو اس کی انسانیت بغاوت کرنے پر تیل گئی۔ اُس نے چاہا کہ اپنی انسانیت کو اس انسانیت عاری موٹر سے ٹکرائے۔ اگر اسکی انسانیت اُس پر غالب نہ آسکے۔ تو ایسی انسانیت کا فنا ہو جانا ہی لازمی ہے۔ لیکن اسکی ماں..... وہ بوڑھی ماں جو اسکے انتظار میں سوکھی تھیں سکتی۔ اور..... اسکی منگینہ جسے اسکے گھر کی سجاوٹ کہتی ہے۔

وہ راہ میں سے ہٹ گیا۔ موٹر قاتلانہ انداز میں آگے بڑھ گئی۔

موٹر کے سامنے سفید خوشنما پھولوں کا ایک گچھا لٹک ہاتھا۔ اُسے یوں محسوس ہوا۔ گویا وہ تمام سفید پھول اسکے ہاتھوں میں آگئے ہیں اور اسکی تنکیاں ایسی حرکت کرنے لگیں۔ جیسے وہ ایک ایک خوشنما پتھر کی کومل ڈالیں گی۔.....

لاہور۔ فروری ۱۹۳۹ء

۶۸

جامل

ہر ایک کی رائے اس کے متعلق مختلف تھی چند ایک کا خیال تھا کہ وہ اول حج
 کا کوئی پچہ لٹکا ہے۔ چند ایک کا کہنا تھا کہ لچر لٹکا کہنا تو خیر زیادتی ہے۔ البتہ
 رند مشرب شخص ہے۔ جس کا کوئی آگاہی چھپا کر لکھا گیا ہے نہیں۔ بہر حال یہ
 بات بالکل واضح تھی۔ کہ وہ انتہا درجہ کا بے فکر شخص تھا۔ اور ایسا جان پڑنا تھا
 کہ اُسے کبھی کسی غم سے واسطہ نہیں پڑا۔ اس کے جسم کی بناوٹ بھی کچھ عجیب قسم کی
 تھی۔ مضبوط جبرے ایک آہنی عزم بنا کر کرتے تھے۔ اور عقلمانی ناک اُسے زیادہ
 ہیبت ناک بنا رہی تھی۔ لیکن اس کے خلاف اس کی آنکھوں میں کڑھکی کا نام نشان
 تک نہ تھا۔ اس کی نگاہوں میں جیسے شیرینی تھی۔ اس کی ہر وقت ڈبڈبائی سی رہنے
 والی آنکھوں کے آگے پانی کی ایک ٹہنی سی اوٹ ہوتی۔ جسکے پیچھے سے ان میں

مظلومیت کا رنگ جھلکتا تھا۔ یہ آنکھیں ہی تھیں جو اس ظاہری شکل سے پیدا ہونے والی کدھلی اور بدبیت کو ایک حد تک ملائم کر دیتی تھیں۔ یا پھر اسکی چال جس میں ٹانگوں کی مضبوط گھٹن کے باوجود لوٹ کھڑا ہٹ یہ ظاہر کر رہی تھی کہ یہ شخص اس مسافر کی طرح ایک غیر یقینی استقلال رکھتا ہے۔ جسے اپنی منزل کا رخ ٹھیک ٹھیک معلوم نہ ہو۔ اور جو محض چلتے جانے کی خاطر ڈگمگانے قدم اٹھاتا ہوا چلا جاتا ہے۔

وہ اپنا نام کلیان بتاتا تھا۔ ایک بالکل مجید شخص جس سے ہسپتال کے تمام مرلین اگر وحشت نہیں کرتے تھے۔ تو کم از کم ڈرتے ضرور دہتے تھے۔ بایں ہمہ وہ سارے ہسپتال کی رونق تھا۔ دو پہر کو جب مرلین دھوپ کے لئے میدان میں جمع ہوتے تو وہ ایسی ایسی مزیداریاں بتاتے کہ عارضین لوٹ پوٹ ہوئے جاتے۔ اسکی سب سے بڑی صفت یہ تھی کہ جس کے پاس وہ ہوتا وہ کم از کم وقتی طور پر تو یہ بھول جاتا کہ میں تب وق کا مرلین ہوں جس کے لئے موت کے سوا اور کوئی علاج نہیں۔ اس وق کے ہسپتال میں جہاں موت کا اعتبار ہر وقت منڈلاتا رہتا ہے۔ جس کے کھلے ہوئے پروں کا سایہ مرلینوں پر کچھ اس طرح پڑا ہوتا ہے کہ انکے سہمے ہوئے چہروں پر امید یا خوشی کی روشنی کا ہلکا سا نشان تک نہیں ہوتا۔ کلیان کی صحبت دم بھر کے لئے تو ان کے چہروں سے یاس کی سیاہی دھو ڈالتی تھی۔ اور آفتاب زندگی غروب ہوتے وقت بھی انکے چہروں پر شفق کی سرخی نمودار جاتی۔ وہ چاہتے کہ اسکی باتیں کبھی ختم نہ ہوں۔ اور سچ مچ وہ ختم ہوتی بھی نہ تھیں۔ گو اس کی زبان

شائستگی کے بجائے پھکڑ پن سے مملو ہوتی۔ لیکن دلچسپی کے لحاظ سے اسکی باتوں کا جواب نہ تھا۔

تمام دن اُس کا کام دیگر مریضوں کی طرح اپنے بستر پر لیٹنا نہ تھا بلکہ ہر ایک کے کمرہ میں جاتا۔ کہیں کم کہیں زیادہ وقت لگاتا۔ حتیٰ کہ رات ہوتے ہوتے وہ سائے اسپتال کا ایک چکر لگا چکا ہوتا۔ اُسے ایسے مریضوں کے پاس جانے میں بھی کوئی باک نہ ہوتا۔ جن سے دوسرے لوگ دس دس گز کی دوری پر رہتے۔ بلکہ ایسے خوفناک مریض۔ جن کے بار بار تھوکنے سے ان کے ارد گرد دس دس فٹ تک کی فضا میں جراثیم وق کا ایک سحرم بے پناہ، جمع ہوا۔ کلین ایسے مریضوں کے پاس دوسروں کی نسبت زیادہ دیر بیٹھا۔ گھنٹوں بیٹھا بائیس کرتا۔ ہنستا ہنستا اور پھر دوسرے مریض کے کمرے میں چلا جاتا یہی اُس کا روزانہ معمول تھا۔

کئی مریض اُسے خطرناک مریضوں، کے پاس اس طرح بیباکانہ جانے سے روکتے۔ تو وہ — محض ہنس دیتا۔ پھر وہ لوگ اسکے منہ پر ہی اُسے ”جاہل“ کہتے۔ اور وہ محض مسکرا دیتا۔ اسکی ان حرکتوں میں کسی بھی شخص کو جھولی کا شائبہ تک نظر نہ آتا۔ کیونکہ اُس جیسے ہیبت ناک شخص کے اندر بھی رحم یا در کا جذبہ ہو سکتا ہے۔ یہ بات ماننے کو کوئی بھی تیار نہ تھا۔ بلکہ اسکی اس بیخونی نے اُسے اُن ڈراؤنے شخصوں کی مانند۔ جو رات رات بھر مر گھٹ میں جلتی ہوئی لاشوں کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ اور زیادہ ڈراؤنا بنا دیا تھا۔ ایک رات وہ سویا ہوا تھا۔ کہ قریبی کمرہ سے ایک مریض کے کراہنے

کی آواز سُکر جاگ اُٹھا۔ ایک سسنان رات میں اور پھر تپ دق کے ہسپتال میں کسی مریض کی کمر آئینہ آواز کچھ ایسی بھیانک ہوتی ہے کہ کلیان ایسا وحشی صفت انسان بھی دہل گیا۔ کتنی ہی دیر تک اُسے اپنے بستر سے نکلنے کی ہمت نہ پڑی۔ اس نے کوشش کی کہ اپنا سر بھی لحاف میں چھپالے لیکن اسکے باوجود وہ آواز اسکے کانوں تک پہنچتی رہی۔ اس وقت اس پر متضا و جذبات چھائے ہوئے تھے۔ خوف گھبراہٹ۔ کچھ کچھ دلیری بھی۔ ملامت نفس بھی۔ اور سب سے زیادہ اس مریض کی چیخوں سے متاثر ہو کر خود چھینے کا جذبہ بھی اور جذبات کی اس جنگ نے اُسے اور بھی نڈھال کر دیا۔ وہ چاہنے پر بھی چارپائی سے اُٹھ نہ سکا۔

اتنے میں اس نے برآمدے میں کسی کے چلنے کی آواز سنا دی اس نقد مول کی چاپ فوراً پہچان لی۔ یہ رات والی نرس تھی جس کے ذمہ رات کے وقت مریضوں کی خبر داری کا فرض سپرد کیا گیا تھا۔ لیکن جس نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے خراٹے بھرنے کے سوا کبھی کوئی کام نہ کیا تھا۔ یا پھر جب کبھی اُس کا کوئی دوست آجاتا۔ تو رات رات بھر اسکے ساتھ ملکر اپنے کمرے میں کچھ ایسا اداہم مچاتی۔ کہ مریض چونک چونک پڑتے۔

بہر حال اس وقت تو اسکے قدموں کی آہٹ نے کلیان کو بہت کچھ سہارا دیا۔ جب طرح بچہ اندھیری سیڑھیوں میں نہایت ہراساں ہو جاتا ہے جیالی جانب اس کی جانب منہ کھولے لپکتے ہیں۔ لیکن اس وقت کہ کوئی بڑا بوڑھا دور بیٹھا ہی اُسے آواز دیتا ہے۔ تو اس کا خوف بہت حد تک دور ہو جاتا ہے۔ اس میں اندھیرا

راستہ طے کرنے کی سکت لوٹ آئی ہے۔ اسپطرح نرس کے بوٹوں کی چاب تے
کلیان میں اتنی ہمت پیدا کر دی کہ اُس نے لحاف میں سے منہ باہر نکال لیا۔
انٹے میں نرس اُس مریض کے دروازہ پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے باہر سے کھڑے
کھڑے ہی آواز دی یہ محمد واسوقت کیوں اتنا شور مچا رکھا ہے۔ دو کمر مریضوں
کو بھی سونے دو گئے یا نہیں۔“

اندر سے ایک ایسی آواز آئی۔ جیسے کوئی شخص ہانپ گیا ہو۔ محض
اس نے اتنا ہی کہا ”مس صاحبہ مرا۔۔۔۔۔“ اور اسکے بعد کھانسی کھانسی
بھی اس قیامت کی کہ کتنی ہی دیننگ اسکاد مٹا رہا۔ حتیٰ کہ کمرے تک کی
آواز آتی بند ہو گئی۔

نرس نے پھر وہیں سے حکم دیا ”اچھا۔ اچھا۔ اسوقت خاموشی سے لیٹے
رہو۔ صبح ڈاکٹر صاحب دیکھیں گے۔۔۔۔۔“ اور پھر آگے بڑھ گئی۔

کلیان کے دروازہ کے سامنے سے گزری تو اُس نے آواز دی ”مس
صاحبہ! اس نے چلتے چلتے آواز دی ”چکے سو ہو۔۔۔۔۔“ اس نے پھر آواز
دی ”ایک ضروری کام ہے۔۔۔۔۔“ نرس نے اس کا دروازہ کھول دیا۔ اور
دہلیز میں کھڑے کھڑے پوچھا۔

”کیا ہے۔۔۔۔۔“ کلیان نے فہمائشی لہجہ میں کہا ”اس بیچائے کو شاید
بہت تکلیف ہے۔ آپ نے اندر جا کر تو دیکھا ہوتا۔۔۔۔۔“

نرس نے ناک بھوں سکڑ لیا۔ ”ہوں۔ اندر جا کر ہم نے اپنی موت مول
لینی ہے۔ وہ ختم ہو رہا ہے۔ مگر وہ نہیں۔ ابھی خاموش ہو جائیگا۔۔۔۔۔“ نرس

نے یہ کہا۔ اور چلی گئی۔

کلیان کے گویا نن بدن میں آگ لگ گئی۔ انسانیت کے خون کو اس قدر سفید ہو گیا دیکھ اس میں اتنا جوش بھر گیا۔ جتنا باغیوں میں ہوتا ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ ابھی خاموش ہو جائیگا۔ یہ فقرے اسکے کانوں میں پگلے ہوئے شیشے کی مانند زخم کر گئے۔ وہ سوچنے لگا۔ تو گویا اس انسان کی زندگی ہی دوسرے انسانوں کی گھبراہٹ کا موجب ہے۔ جب اس پر خاموشی۔ ایک ابدی خاموشی طاری ہو جائے گی۔ تو سب۔ یہ نرس۔ یہ مریض۔ یہ انسان۔ سب کو چین کی نیند چھو بیٹھ جائے گی۔

ان خیالات نے اسکے دل سے تمام درد تمام خوف و دھواں الٹا دیر کر دیا۔ ہٹ جانے پر اسکی انسانیت پھر جھک اٹھی۔ اسے محمد کے کمرہ میں موت کا فرشتہ صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اور وہ نہ ہڑک اس کمرے میں چلا گیا۔ دیگر مریضوں کو اس کمرہ میں کلیان کے جانے کی آہٹ ملی۔ تو سب نے اپنے اپنے منہ میں یہی لفظ دہرایا۔

محمد دھونکنی کی طرح دھونک رہا تھا۔ اسکے پیچھے بڑے بالکل خالی ہو چکے تھے۔ چنانچہ اسکی آنکھوں میں آنسو بہا رہا تھا۔ بار بار اسے کھانسی آتی تھی۔ اور اسکا دم اُکھڑا کھڑا ہوتا تھا۔ کلیان اسکے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اسکے سینہ کو آہستہ آہستہ ملنے لگا۔ جس سے اسکی کھانسی قدرے بند ہوئی۔ محمد نے خون سے بنا ہوا آنسو پھینکا۔ اور نہ ہال ہو کر پانی مانگا۔ کلیان بھاگا بھاگا

گیا۔ اور اپنے آنسو میں پانی لے آیا۔ پانی کے دو گھونٹ پی کر محمدؐ کو صیغے
 جھونش آگیا۔ اس نے بچوں کی طرح اپنا سر کلیان کی گود میں رکھ دیا۔ کلیان
 آہستہ آہستہ اُسے سہلانے لگا۔ محمدؐ بس کلیاں بھرنے لگا۔ کلیان نے پوچھا۔
 ”کیوں محمدؐ روتے کیوں ہو؟“

محمدؐ نے روندھے ہوئے گلے سے جواب دیا۔ ”تو کیا میں مر جاؤنگا
 کلیان۔۔۔۔۔؟“

کلیان نے پوچھا۔ ”کیا تم جینا چاہتے ہو؟ کس کے لئے؟ تمہارا
 کوئی ہے۔۔۔۔۔؟“

”یہ دنیا تو ہے۔ اسے چھوٹنے کو جی نہیں چاہتا۔۔۔۔۔“ محمدؐ نے
 جواب دیتے ہوئے ایک لمبی سانس لینے کی کوشش کی۔ لیکن بھیڑیوں میں
 اس قدر تناؤ کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے بے بسی کے عالم میں
 سر پھینک دیا۔

کلیان اس کی بات سُن کر ہنس دیا۔ محمدؐ نے اُسے ہنستے دیکھ کر کہا
 ”تم کتنے اچھے ہو کلیان۔ کتنے سخی ہو۔ تمہیں کوئی دکھ نہیں۔۔۔۔۔“
 کلیان پھر ہنسا۔ اور کہنے لگا۔ ”تم نے کیسے سمجھا۔ کہ مجھے کوئی دکھ نہیں؟“
 ”تم ہر وقت ہنستے جوتے ہو؟“ محمدؐ نے جواب دیا۔

کلیان کہنے لگا۔ ”محمدؐ۔ کسی کے ہنسنے سے اسکی خوشی کا اندازہ نہیں لگایا
 جاسکتا۔ بلکہ جو بہت ہنستا ہے۔ اُسے سمجھو۔ کہ بہت زیادہ دکھ ہے جسے چھپانے
 کے لئے وہ اتنا ہی زیادہ ہنستا ہے۔ جتنو دکھی دیکھتا ہے۔ اُن کو ہنسا تا پھر تا ہے۔“

گویا اُنکے درویش بھی حصّہ بنا کر اپنے میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے..... محمود کا سانس بہت جلدی جلدی چل رہا تھا۔ اعفاء ایک ایک کر کے ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے۔ لیکن دق کا مریض ہونے کے باعث اسکے حواس ابھی تک باطل نہیں ہوئے تھے وہ کلیان کی بات سن رہا تھا۔ اور کلیان کہے جا رہا تھا۔

”تم جانتے ہو۔ کہ میں تمام دن کیوں مریضوں کے ساتھ ہنستا ہنستا رہتا ہوں۔ نہیں یہ تو معلوم ہے نہ کہ دق کے مریض کی دلی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ جنہیں اس کا کچھ مفقود اس کا بھی علم ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک بار یہ مرض لگ جانے کے بعد فرشتہ موت کے سوا اور کوئی اس کا علاج نہ کر سکے گا۔ اُنکی ذہنی کیفیت اُس شخص سے کچھ بھی مختلف نہیں ہوتی۔ جسے یہ علم ہوتا ہے کہ صبح مجھے پھانسی ہو جائے گی۔ ایسے شخص کے دماغ سے وقتی طور پر موت کا ڈر اونا خیال بٹا دینا اور اسے ہنسا دینا ناممکن ہے۔ لیکن میں اسے ممکن کر دیتا ہوں خصوصاً جب کوئی نیا نیا اس مرض میں پھنستا ہے۔ تو اسکی مایوسی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہوتا۔ اسی لئے میں ہر نئے آنے والے کی طرف سب زیادہ توجہ دیتا ہوں۔ اور جس قدر زیادہ مریضوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اسی قدر اُن سب کا در و سمٹ سمٹا کر میرے دل میں گھر کرنا چلا جاتا ہے“

محمود نے اپنی بکھرتی ہوئی طافت کو آخری بار سمیٹ کر کہا: ”تم فرشتہ ہو۔“

کلیان

”نہیں۔ ہم جاہل کہلاتے ہیں“ کلیان نے اُسی لہجہ میں کہا: ”موجودہ دنیا کی انسانی تہذیب یہ ہے کہ مریض کو چھوٹا تو کیا۔ اسکے کمرہ میں بھی نہیں جانا۔“

”دق کے مریض کا رشتہ دار؟ ڈاکٹر صاحب آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“ ڈاکٹر نے پھر پوچھا ”گاؤں میں کوئی مکان وکان ہے؟“ جی ہاں۔ ایک ٹوٹا بھڑا تو اسی کو بیچ ڈالو۔“

کلیان اپنے گاؤں گیا۔ اور اپنا جدی مکان ڈیڑھ سو روپے میں بیچ کر چلا آیا۔

جس روز وہ ہسپتال لوٹا۔ اسی روز اس نے سنا کہ ایک تیا مریض داخل ہوا ہے۔ جسکے ساتھ اسکی بیوی اور ایک پانچ سالہ بچہ بھی ہے۔ کلیان اُس نئے مریض کے کمرہ میں گیا۔ اس سے تعارفی باتیں ہی کر رہا تھا کہ ایک خوبصورت سا بچہ کمرہ میں آیا۔ اور ایک اجنبی کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ کلیان نے بڑھ کر اُسے اپنی گود میں لے لیا۔ اُسے پیار کرتے ہوئے اسکے باپ پوچھا۔

”کتنا پیارا بچہ ہے۔“ کیا نام ہے اس کا۔“ اس نے جواب دیا۔

”للت کمار۔“ کلیان نے پھر او کوئی بات نہ پوچھی۔ چپکے چپکے اس بچہ کا منہ دیکھتا رہا۔ اور کچھ دیر کے بعد اسکی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے وہ کلیان جیسے آج تک ہسپتال میں کسی مریض نے روتے تو کیا۔ بلول خاطر بھی نہ دیکھا تھا۔ آج ایک اجنبی کے سامنے اسکے بچہ کو پیار کرتا ہوا رو پڑا اُس نے جھٹ اپنے آنسو پونچھ لئے۔ مریض نے پوچھا۔

”تم رو کیوں پڑے۔“ بھائی۔“ کلیان نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میری بھی بیوی تھی۔ اندرا۔ اور آج پانچ سال ہوئے۔ میرا بھی ایک بچہ

اس نے بار بار کلیان کو یہ فقرہ بڑبڑاتے سنا۔ لگتا تھا کہ بار بار میرے پاس آتے ہو اور ہر بار اندر انہیں مجھ سے چھین لے جاتی ہے۔ لیکن اب کی بار میں نہیں نہیں چھوڑوں گا۔ اندر کو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔

بہر حال صبح کلیان کے کمرہ میں اسکی لاش پائی گئی۔ اس نے کسی زہریلی شے سے خودکشی کر لی تھی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد خودکشی کی رپورٹ لکھتے ہوئے کہا: "چلو۔ اس جاہل سے تو ہسپتال کو کھڑی ملی۔"

لاش کے چہرہ پر تبسم تھا۔ گویا ڈاکٹر کی اس بات پر کلیان مرنے کا بھی منہس نہ تھا۔

اُسی صبح اُس نو آمدہ مریض کو اپنے کمرے میں ڈیڑھ سو روپے کی ایک پوٹلی ملی۔ جس کے ساتھ ایک چھٹی تھی۔

"جھگو ان کے لئے ان لوگوں کو یہ نہ بنانا۔ ورنہ تم سے یہ روپے چھین نہیں گے۔"

انکی تہذیب کا قانون یہی ہے۔ کہ وہ بے نہیں سکتا چھین سکتا ہے۔

ٹنگرگ۔ اکتوبر ۱۹۴۱ء

یہ بھی آدمی ہیں

ابھی اس نے کل ہی آنکھیں کھول کر پہلی بار روشنی کی چکا چوند دیکھی تھی۔ اور آج اُس نے دیکھا کہ روشنی کے نمودار ہوتے ہی اُسکی ماں کہیں چلی گئی۔ اُسکی ننھی ننھی اور کچی آنکھیں چند ہی قدموں تک ماں کا تعاقب کر سکیں اور تھک کر لوٹ آئیں۔

نجانے اسے کیا سوچھی کہ ننھے ننھے بازوؤں میں طاقت بھر کر اُس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی کہ چانک ایک وزنی بازو نے اُسے دبا دیا۔ گردن اٹھا کر دیکھا۔ تو اُس کا باپ لال لال آنکھیں نکالے اسے اپنے پیروں سے دبارہا تھا۔ بیچارہ سہم کر وہیں بیٹھ گیا۔ اور ایک بار باپ کی خنکی صورت دیکھ لینے کے بعد سارا دن اُسے پرتک ہلانے کی ہمت نہ پڑی۔

دوسرے روز ماں گھر پر ہی رہی وہ سارا دن گھونسلے میں پھدکتا پھرا ایک بار گردن لمبی کر کے گھونسلے سے باہر کی دنیا کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اوپر کوئی نیسی نیسی شے کھنڈی ہوئی تھی۔ اسکی نگاہ نیچے کی طرف گئی۔ تو وہ پکڑا گیا اور شاید گم ہی پڑتا۔ لیکن اسکی ماں نے جھٹ اسکی ننھی سی دُم کی چونچ میں تھام لیا۔ وہ سہم گیا۔ لیکن ماں نے شفقت سے پیار کرتے ہوئے دل بڑھایا کہ تم میرے لال گھبراتے کیوں ہو۔ بڑے ہو گے تو اس سے بھی بڑی اونچاؤں سے کود جا کر دو گے۔ تب تم بھی ہمارے ساتھ دو اس نیلے آسمان کی پرلی طرف دانہ لانے جا یا کر دو گے۔ وہاں جہاں کھیت ہی کھیت ہیں۔ اس راستہ میں بہت اونچے اونچے محل ہیں۔ جہاں سے ہر رات کوئی شرارت کر کے صبح دم ہی سوچ شرم سے منہ لال کئے بھاگ نکلتا ہے وہاں۔ اس طرف جہاں سنہرے سنہرے کھیت ہیں۔ تو اپنی بیوی کے بستر پر بچھانے کے لئے وہاں سے سنہری گھاس کے نرم نرم تنکے لایا کرے گا۔

ماں کی باتیں سنتے سنتے ننھے ننھی کے دل میں نہ جانے کون کونسی انگلیں سر اٹھانے لگیں۔ اُس نے ایک بار اپنی دُم کو ابھار کر اور گردن کڑی کر کے آسمان کی طرف نگاہ کی۔ جیسے اُن بلند یوں کو مخاطب کرتا ہوا یہ مصرع گنگنا ہوا۔

اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

بالآخر وہ دن بھی آیا جب وہ پہلے پہل اپنی ماں کے ساتھ تھوڑی تھوڑی دوپٹے تک اڑان کرنے لگا اور آخر کار وہ کھیتوں تک جانے لگا۔

راستے میں وہ شاہی محلوں کے اوپر سے گزرتے۔ وہاں باغ تھے، ننھے

نتھے خوش ما پھول۔ ذرا سے۔ شاندار فلک بوس عمارتیں۔ رنگارنگ پرے
 قبیلہ جھار ہیں۔ یہ سب چیزیں اُس کے دل کو لکھاتیں۔ ایک روز وہ
 ماں کو کہہ کر ایک باغ میں اُترا۔ نتھے نتھے بچے خوبصورت ریشمی کپڑوں میں
 ملبوس ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ چند عورتیں نفیس جھلمل ٹکڑی ساڑھیاں
 پہنے خراماں خراماں کیاریوں میں ٹہل رہی تھیں نتھے نے ماں سے پوچھا۔
 ”یہ کون ہیں؟“

ماں نے کہا: ”یہ آدمی ہیں بیٹا۔“
 اُس نے سوچا: ”آدمی“ یہ آدمی کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ کس قدر عیش
 مہیا ہے انہیں۔
 اچانک اُسے ایک خیال آیا اور ماں سے پوچھنے لگا:-
 ”لیکن یہ یہاں بیکار کیوں پھرتے ہیں۔ کھیتوں سے دانہ لانے کیوں
 نہیں جاتے۔؟“

ماں نے جواب دیا:-
 ”انہیں یہیں بیٹھے بٹھائے مل جاتا ہے بیٹا۔“
 اب تو اُسے آدمی کی خوش بختی میں رُتی بھر بھی شبہ نہ رہ گیا۔ اور اُس
 دن کے بعد وہ صبح شام کسی نہ کسی طرح آدمی بننے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ وہ ہر
 وقت دست بہ دعار ہوتا کہ کاش میں بھی آدمی بن جاؤں۔
 اسی طرح چند روز گزر گئے اور آدمی بننے کی خواہش اُس کی رگ رگ میں
 سرایت کر گئی۔

انہی دنوں ایک دن ماں اُسے کسی اور جانب لے گئی۔ راستے میں چند ٹوٹی
 بھوٹی جھونپڑیاں نظر پڑیں۔ وہاں سے بدلو کا ایک ابرسا اوپر اٹھ رہا تھا یہاں
 سے گزرتے گزرتے مرزا ندھ کے ماں اسکا ناک میں دم آگیا۔ اور اُس پرستم بہرہ
 اُن جھونپڑیوں کے کہیں نزدیک ہی اُسکی ماں اُتر پڑی۔

وہاں اُس نے چند چھوٹے چھوٹے بچے بھی جھونپڑیوں سے نکلتے دیکھے بچے
 پُرانے لٹے پہنے۔ اُن کے چہرے میلے کھیلے اور بال بکھرے ہوئے تھے بہرہ
 لڑکے ایک لڑکے کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے۔ پہلا لڑکا بیچارا چلانا جا رہا تھا
 اور آخر بیچارا ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ دوسرے بچوں نے آتے ہی اُسے دلوچ لیا۔ وہ
 بیچارہ روٹی کا ایک ٹکڑا اچھپا رہا تھا۔ اور دوسرے اُس سے وہ چھیننے کی
 کوشش میں تھے۔

اُس نے ماں سے پوچھا: ”ماں یہ کون ہیں؟“
 اُس نے جواب دیا: ”یہ بھی آدمی ہیں بیٹا۔“
 اُس نے پھر پوچھا: ”لیکن آدمی تو ایسے نہیں ہوتے اور پھر یہ لڑکے کیوں
 ہیں؟“

”اس سے یہ روٹی کا ایک ٹکڑا چھین رہے ہیں۔“
 ”تو بہ اور روٹی کیوں نہیں لے لیتے؟“
 ”ان کے گھر شاید اور ہوگی ہی نہیں۔“
 اتنے میں ننھے بچہ نے دیکھا کہ پچھے پرانے کپڑے پہنے کھیتوں میں سے
 ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا۔ اسکی چوٹی سے لیکر اڑی تک پسینہ بہا تھا۔ وہ لڑکوں

کے قریب آیا اور انہیں پہننے لگا۔ آخر پہلے بچے سے روٹی چھین کر وہ خود کھا گیا بچے اُسے دیکھتے ہی رہ گئے۔

”نٹھے پنٹھی نے پھر ماں سے پوچھا: ”یہ کون ہے؟“
 ”یہ بھی آدمی ہے بیٹا۔“

”تو جو کچھ مائے اس کے منہ سے نکل گیا۔ لیکن اس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ اس نے جھلمل جھلمل کرتی ساڑھی بھی نہیں پہن رکھی، اور یہ چھوٹے آدمی بھی روہے ہیں۔ ان کو روٹی بھی کھانے کو نہیں ملتی۔ انکے گھر بھی بچتہ اور خوبصورت نہیں۔ بلکہ ہمارے گھونسلوں کی طرح گھاس بھوس کے بنے ہوئے ہیں پھر بھی یہ آدمی ہیں۔ یہ وہاں کیوں نہیں جا بیستے جہاں محل میں خوبصورت باغ ہیں۔ اور جھلمل کرتے کپڑے ہیں۔“

”ماں نے کہا: ”بیٹا یہ آدمی تو ہیں۔ لیکن غریب۔ محلوں والے امیر آدمی تھے یہ غریب لوگ خون اور پسینہ ایک کر کے پیدا کرتے ہیں۔ اور امیر لوگ انکی کمانی چھین کر عیش کرتے ہیں۔“

”نٹھا پنٹھی اس سے زیادہ نہ سُن سکا۔ اسکے ننھے دل پر ایک چوٹ لگی اُسے جیسے غش آنے لگا۔ ننھے بچے اب تک اس کی جانب متوجہ ہو چکے تھے اُسے یوں معلوم ہوا جیسے وہ اس کی طرف آتے ہوئے کہہ رہے ہیں: ”او۔ تم آدمی بنو گے او۔“ — ہم تمہارا استقبال کرنے آئے ہیں۔“

وہ زور زور سے چیخنے لگا، بچے اسکو کپڑے کے لئے دوڑے۔ اسے بجلانے کیا ہو گیا تھا کہ اسکے پر دل میں پرواز کی طاقت ہی نہ رہ گئی تھی بچوں نے اُسے

اُکڑو بوج لیا۔ وہ اب بھی زور زور سے چیخ رہا تھا جیسے بچوں کو کچھ کہہ رہا ہو۔ لیکن اسکی بات کوئی بھی سمجھ نہ سکا۔ آخر وہ آدمی ہی تو تھے۔
 بچے اُسے پکڑ کر پھر ہنسنے لگ گئے تھے۔ لیکن وہ اب بھی چلا چلا کر انہیں کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ اپنی چونچ سے بار بار اُس طرف اشارہ کر رہا تھا۔
 جدھر وہ محل تھے اور جھلمل کرتی ساڑھیاں۔

لاہور۔ اپریل ۱۹۳۹ء

گیا تو

اتنے دنوں کا میل ملاقات ہوتے بھی میں اُسے اچھی طرح سمجھ نہ سکا تھا۔ اور اگر میں نے اُس کے متعلق کوئی رائے قائم کی بھی تھی۔ تو وہ غلط تھی۔ اُس روز میرے سامنے ہی جب اُس نے بیٹھ کا اور ام کو اپنی ڈیڑھ فٹ آگے بڑھی ہوئی تو ند کو اٹھائے ہوئے اپنی دوکان سے گزرتے دیکھا۔ تو اچانک اسکے لبوں سے یہ فقرہ جیسے پھسل گیا۔

”آخر اس شخص کو اتنی دولت رکھنے کا کیا حق ہے حقیقت یہ ہے کہ اس شخص میں شہریت اس قدر بھی نہیں کہ اسکی تو ند کے اندر گھسی ہوئی گہری نان ہی اس سے لبالب ہو جائے۔ اور دوسری طرف ایسے شخص بھی ہیں جو سر سے لیکر پیر تک اوچھڑے کی بیرونی سطح سے لیکر دل کی گہرائی تک سراسر شہریت ہی

شعرت ہیں۔ لیکن وہ.....“

پھر اچانک اس کی نگاہ میری جانب مڑی۔ اور وہ جیسے چونک کر ٹھٹھک گیا۔ گویا یہ کہتے وقت اُسے اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا کہ کوئی اور بھی میرے پاس بیٹھا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اس میں پھروسی سنجیدگی آگئی۔ جس نے اُسے میرے لئے قابلِ توجہ بنا رکھا تھا۔ کیونکہ ایک دوکاندار کا اس قدر سنجیدہ مزاج ہونا کہ بعض وقت گاہک سے بھی بات ننگ نہ کرنا۔ اور اس بات کا کوئی لحاظ نہ رکھنا کہ میرا گاہک مڑ جائے گا۔ یقیناً قابلِ توجہ ہوتا ہے یہ بھی باعثِ تھا کہ جب میں نے اس کو چہرے میں نقلِ مکافی کی۔ تو گویا دوکاندار بھی اُن تین چار ہستیوں میں سے تھا۔ جو اس محلہ کی کلرک آبادی کی عام اور سپت سطح سے ابھری ابھری معلوم ہوتی تھیں۔

اُن میں سے میرے لئے ہر ایک کی انفرادیت کسی مختلف خصوصیت سے مٹی۔ مثلاً لالہ راجہ اکشن تھے۔ جنکی ایک مستقل عادت تھی کہ شام کو دفتر سے لوٹے تو گلی ہی میں چارپائی بچھا کر بیٹھ جاتے۔ گلی میں محض ایک بنیان ہوتی اور لمبی نے والا بیچو اُن تو گویا اُن کا ازیں سا تھی تھا۔ اور اس تصویر کا لازمی جزو کوئی ڈبڑھ ورجن کے قریب بچے ہونے۔ جگہ بیٹھ جانے کے بعد چارپائی کا کوئی بھی حصہ نظر نہ آسکتا تھا۔ یہ بچے خالص انکی اپنی پیداوار تھے۔

اور دوسرا راجہ چار تھا۔ جو لالہ جی کے طہیلے ہی میں دو بچے مہینہ ویکہ رہتا تھا۔ اُس کی خصوصیت اُسکی حسین بیوی تھی۔ جو غالباً محلہ بھر کی عورتوں سے زیادہ جاذبِ نظر تھی۔ اُسکے سینہ کی ترچھی سی اٹھان اور اسکے انگوٹیاں

لیتا ہوا لوح۔ ایسی خصوصیات تھیں جو کسی بھی لاکیر کے پاؤں باندھ لینے کے لئے کافی تھیں۔ رامو اُسے بہت پیٹا کرتا تھا۔ اور یہ طعنہ تو ہر شام دیا کرتا کہ ”وہ دیکھ۔ لالہ رادھا کشن کی عورت۔ تجھ سے دو بالشت چھوٹی ہوگی۔ میں نقش بھی تجھ ایسے نہیں لیکن پھر بھی کتنی زرخیز ہے۔ تجھے تو جیسے کال پڑا ہوا ہے۔“

اور تیسرا تھا یہی گیا نو دو کا نڈار۔ کوچہ کے سرے والی دوکان میں نمک تیل کی ہاٹ لگائے بیٹھا ہوتا۔ منحنی جسم۔ لمبا قد۔ چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی لیکن آنکھوں میں ایک بانگین۔ کنگلی کے بغیر بال بکھرے ہوئے جبکی چند لیں عموماً پیشانی کو ڈھانپنے رہتیں۔ باقی بدن چند بے ترتیب کپڑوں میں ڈھنپا رہتا لیکن مجھے پہلی ہی نظر میں اُس بے ترتیبی کے اندر بھی ایک لطیف سی ترتیب کا احساس ہو گیا تھا۔ گویا وہ کوئی شعر تھا۔ جسکے الفاظ کی بے ترتیبی میں بھی ایک جدائی کیفیت مرتب ہوتی ہے۔

یہ شخص کچھ عجیب طرح کا دوکاندار تھا۔ جسے میں نے گاہکوں سے کبھی دلچسپی سے گفتگو کرتے نہ سنا تھا۔ کسی گاہک کو سووادینا۔ تو ایسا محسوس ہوتا گویا کوئی تنگ فرض انجام دے رہا ہے۔ پہلے پہل تو میں نے یہی سمجھا۔ کہ یہ دوکاندار کا نوکر ہے۔ اور مالک سے اسکی بگڑی ہوئی ہے۔ بلکہ ایک دن تو اسکی حرکت نے مجھے بت ہی بنا دیا۔ آسمان پر سورج ہی سے بادل چھا رہے تھے۔ اور دس بجتے بختے آسمان پر اُودی اُودی بدلیوں اور کالے اور سفید بالوں کے جھگھٹ نے کچھ ایسا نظارہ پیش کیا۔ کہ میں اسمیں بالکل کھو گیا۔ اور خدا جانے میں کب تک اسی کیفیت میں رہتا اگر بلبل اچانک میرے کندھے جھٹک کر اونچی آواز میں یہ نہ کہتی: ”کیا دفتر جانا بھول گئے“

— اُس نے خدا جانے ہلکی ہلکی کتنی آوازیں لگانے کے بعد اپنے گلے کا
 آخری سُر استعمال کیا تھا۔ لیکن اس آسمانی نظارہ کی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ مجھے
 ایسا ہی معلوم ہوا۔ جیسے کوئی الہڑو شیرہ پنچم کے سر میں گارہی ہو۔ میں نے اسی
 سرشاری کے عالم میں اسکے گالوں پر ہلکا سا بوسہ دیا اور یہ سوچتا ہوا کہڑے
 پہننے لگا۔ آخر چھٹی کا روز کیوں معین ہے۔ کیوں نہ جس روز کسی کا جی چاہے۔
 اُسی روز اُسے اتار منانے کی اجازت ہو۔ — بہر حال خواہی نخواہی میں
 جلدی جلدی گھر سے نکلا۔ تو لیلانے اندر سے آواز دی۔ ”آندہ پوٹے کھلنے کو کہتا
 ہے۔ ذرا گیا تو سے سوچی لے کہ تو دیتے جلیئے“

میں گیا تو کہے ہاں پہنچا۔ تو دیکھا۔ کہ جناب کی نظریں زمین پر پڑتی ہی نہیں
 آسمان کی جانب ایک ٹک دیکھ رہے ہیں۔ اور خدا جانے مہ میں کیا گلگنار ہا تھا۔ میں نے
 ایک دوبار سوچی کی فرمائش کی۔ لیکن مجھے جواب کون دے۔ گیا تو نہ جانے کس
 دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ جب پکارنے تک نوبت پہنچی۔ تو اُس نے کسی پہنچے ہوئے
 صوفی کی طرح شرابی آنکھوں سے میری جانب گھور کر دیکھا مجھے پہچانتے ہی
 اسکے ماتھے کی تیوری تو دور ہو گئی۔ لیکن اسکے چہرہ پر کانٹیلین جوں کا توں
 قائم رہا۔ میں نے پھر سوچی مانگی۔ اس نے نہایت بے دلی سے پڑیا بند کرنے
 ہوئے خود ہی اپنی اس حرکت کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی۔ — بابو۔
 کیا آج بھی سودا بیچنے کا دن ہے۔ — اور میں نے اسکی آنکھوں کے کونوں
 سے اڈتا ہوا پانی دیکھا۔ مجھے فرصت نہ تھی۔ اسلئے میں کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ لیکن سیر
 دل میں وہ فقرہ اور اسکی وہ مناک آنکھیں کچھ اس طرح کھب گئیں۔ کہ آج تک

اُن کا نقش نہیں مٹ سکا۔ لیکن پھر بھی میں اُسے گیا نو دو کا نذر ہی سمجھتا رہا۔ ایسا دو کا نذر جسکے لئے بننے کا لفظ عام ہے۔ یہ لفظ خود اس قدر تصور زرا ہے کہ اسکی تشریح فضول ہے۔ لیکن آج جو فقرہ سیٹھ کا لورام کو جانے دیکھ کر اسکی زبان سے از خود پھسل گیا۔ اُس نے مجھے یقین دلادیا کہ میں نے اُسے آج تک غلط سمجھا تھا۔

میرے محبوب کو نے پر اُس نے اپنی جو داستان سنائی۔ اس سے میرے جذبہ تجسس کو تو سکون حاصل ہو گیا۔ لیکن میرے دل کا سکون چھین گیا۔ آجنگ جب بھی مجھے اُس دوکان کے سامنے سے گزرنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ تو گیا نو دو کا نذر کو ایک کاغذ پر کچھ کہتے دیکھ میری آنکھیں ڈبڈباتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اُنسو گیا نو کے انجام پر پہنتے ہیں۔ یا اُس کا غندی پیرزے کے ہونے والے انجام پر۔ اور ہر بار میرا دماغ اس کہانی کو دہرا جاتا ہے۔ کہ کس طرح اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہونے کے باعث وہ اُن کی آشناؤں کا مرکز تھا۔ جو بڑھاپے کی اوپر دکھا بڑ زبیں ہیں دو دو گمانے بوڑھوں کا سہارا ہوگا۔ اُن کا گھرانہ مالی لحاظ سے اُس طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ جو وسطی طبقہ سے کچھ نیچے لیکن بھیک منگوں اور فروروں کے طبقہ سے کچھ اونچا ہی ہوتا ہے۔ اگر یہ اکلوتا بیٹا نہ ہوتا۔ نہ شاید اس کی تعلیم ابتدائی حدود بھی پار نہ کر سکتی۔ بہر حال اسی خصوصیت کے سبب وہ میٹرک تک تعلیم پاچکا تھا اور اس سے زیادہ انکی ہمت سے باہر تھا۔

بقسمتی سے اس تشنہ تکمیل ذہنی ارتقاء نے اس کے ایک فطری جوہر کو بے نقاب کر دیا جسے اس کے ذوق و شوق نے بعد ازاں خوب جلا دی۔ یہ جوہر تھا۔۔۔۔۔ شاعری۔

چونکہ قدرت ہی کی جانب سے اُسے شاعری و ولایت کی کٹی تھی۔ اسلئے تھوڑے ہی عرصہ میں یہ جوہر کچھ اس طرح چمکا۔ کہ اچھے اچھوں کی آنکھیں چند با گئیں۔ لیکن ادھر وہ اس پریم رس میں ڈوبنا چلا گیا۔ اُدھر اسکے ماں باپ کو ایسا محسوس ہونے لگا۔ کہ لڑکا ہاتھوں سے جا رہا ہے۔ اُنکی آٹناؤں پر پانی پھرتا دکھائی دینے لگا۔ انہوں نے ہر طرح اُسے اس راہ پر جانے سے روکنے کی سعی کی۔ لیکن یہ اُسکے بس کی بات تھوڑا ہی بھٹی۔ وہ تو جیسے کسی غیر مٹی کشش کے باعث اس ندی کی گہرائیوں میں اترا چلا جا رہا تھا۔ جوں جوں پانی اسکے مختلف اعضاء کو ڈھاتنا چلا جا رہا تھا۔ اس پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوتی چلی گئی۔ کہ وہ از خود رفتہ سا ہو کر اسکی گہرائیوں میں اترا چلا گیا۔

یہ عالم دیکھ کر اسکے ماں باپ اور زیادہ بھنبھلاتے۔ وہ اسکی بے بسی کو سمجھ نہ سکتے تھے۔ وہ سمجھتے بھی کیوں کر۔ انہیں کیا معلوم کہ ایک شاعر شاعری کرنے پر مجبور کیوں ہوتا ہے۔ اس بات کو تو کچھ وہی سمجھ سکتے ہیں جو یہ جانتے ہیں۔ کہ ایک بشرانی شہ راب کیوں پیتا ہے۔ ایک عاشق عشق سے کیوں مرنے نہیں موڑ سکتا۔ اور ایک مور ساون کے بادلوں کو دیکھ کر کیوں دیوانہ وار ناچ اٹھتا ہے۔

اسی رستہ کشی کے ساتھ ہی ساتھ اسکی شہرت پرواز کرنے لگی۔ مشاعروں

جانتا تھا کہ ایسے ایسے فقرے محض رسمی طور پر کہہ دیئے جاتے ہیں۔ ورنہ کہنے والے کی مراد یہ نہیں ہوتی۔ وہ اس طرح کے رسمی تکلفات کے قریب میں مبتلا رہا۔ اسکے ان رسمی ملاحوں میں چند ایک امیر شخص بھی تھے۔ جن سے اس نے اپنی بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ لیکن اس دل خوش کن سراب کا قریب بہت دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ اُسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہ امیر لوگ شاعروں کو محض اپنا دل بہلاوا سمجھتے ہیں۔ اور اگر سیٹج پر انکی تعریف کرتے ہیں تو اسلئے نہیں کہ وہ درحقیقت انہیں کوئی ممتاز ہستی سمجھتے ہیں۔ بلکہ محض اسلئے تاکہ وہ لوگ انکے تفریح بخش کھیل کو جاری رکھیں۔ وہ چند ایک اشخاص کے ہاں اپنی دانست میں، انہی کی دعوت پر گیا۔ لیکن وہاں اُسے گھنٹوں ڈیوڑھیوں میں انتظار کرنا پڑا اور جب ملاقات بھی ہوئی۔ تو اُسے اپنے میزبانوں کا رویہ ایسا معلوم ہوا۔ گویا وہ کسی بھک منگے سے باتیں کر رہے ہیں۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر اسکے دلوں پر اس پر جانا لازمی تھا۔ لیکن وہ شاعر تھا۔ ایک حقیقی شاعر۔ جو کسی صلہ کی پروا یا ستائش کی تمنا میں شعر نہیں کہتا۔ بلکہ اسلئے کہتا ہے۔ کیونکہ وہ شعر کہے بغیر رہ نہیں سکتا۔ کوئی سننے والا ہویا نہ ہو۔ لیکن وہ اپنا پیغام سناتا جائیگا۔ اور جب کبھی کسی ایک ہستی کا دل تڑپ اٹھا۔ کسی اہل دل کی آنکھ سے آنسو کا ایک ہی قطرہ ٹپک پڑا۔ یا اُسکے پیغام کو سنکر کسی ایک روح نے اپنے بازو سے پرواز کھول دیئے۔ یا کسی نے اُسکے پیغام سے متاثر ہو کر کبھی کسی یتیم بچے کو پیار سے اپنی گود میں لے لیا۔ یا کسی افسر نے اپنے کسی ہر وقت جھڑکے جانے والے غریب مفلس چہرے پر اسی سے ہنسکھہی بات کر لی۔

تو اُس کا مقصد — اُسکی شاعری کا مقصد اُسی دم پورا ہو جائیگا خواہ ان میں سے ایک بھی واقعہ اُسکی حیات میں ظہور پذیر ہو یا بعد الموت بغرضیکہ وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز بحر شاعری کی گہرائیوں سے موتی رولتا رہا۔

اس کے ماں باپ بھی (اپنی دانست میں) بگڑے ہوئے لڑکے کو سہانے کی ہر ممکن کوشش کر چکے تھے۔ لیکن اس نے سدھرناتھا نہ سدھرا۔ آخر کار انہوں نے اپنے ترکش سے آخری تبر نکالنے کی ٹھانی۔ اور یہ ہتھیار تھا — شادی۔ ان جہانزیدہ بزرگوں کو یقین تھا کہ جب بیوی پہننے کھانے کو مانگے گی۔ تو اُسکی تمام شاعری نکل جائے گی۔

ایک روز ماں نے بیٹے سے نہایت رازدارانہ لہجہ میں کہا: تمہارا باپ لڑکی جگہ نسبت کرنے کو کہتا ہے۔ میں لڑکی دیکھ آئی ہوں۔ نین نقش ایسے سندھ میں گویا آسمان سے کوئی سپر اُتر آئی ہے۔ ہماری ذات برادری میں تو ایسی لڑکی ملنی کیا دیکھنی تک مشکل ہے۔“

شاعر۔ اور پھر حسن کی تعریف سنکر محل نہ جلے۔ پھر وہ شاعر ہی کیا۔ نادان پس تجویز سے بلکہ خوش ہو گیا۔ اُس نے سوچا۔ کہ پہلو میں کسی حسین کی موجودگی میرے تخیل کو پر لگا دے گی۔ کسی کی مدافعی آنکھوں کی شراب میں تمام دنیاوی تفکرات ڈوب جائیں گے۔ لیکن اس نے یہ نہ سوچا۔ کہ اس شراب کی قیمت اُسے کیا ادا کرنی پڑے گی۔

شادی کے بعد جو کچھ ہوا۔ اُسی کی زبان سے سنیئے۔

”بابو۔ آپ نے کبھی اس شخص کو دیکھا ہے۔ جس نے راہ پر خود منزل کو قریبان کر دیا۔ یا وہ شخص جس نے اپنی کشتی کو زیادہ مقصد پر بنانے کے لئے اسکی مرمت کرائی ہو۔ اور اس مرمت کے عوض میں اپنی وہی ٹاؤ دے ڈالی ہو۔ اور خود پرلے کنائے پیر ہی رہ گیا ہو۔ اگر کسی ایسے شخص کو دیکھنا چاہتے ہو۔ تو مجھے دیکھو۔ جس نے اپنی شاعری کو جلا دینے کے لئے ایک حسین سے عقد کیا۔ اور اسکے عوض اسی شاعری کو نذر کر دیا۔“

اگر ہمارے گھر میں کچھ باقی تھا۔ تو وہ میری شادی کی بھینٹ ہو گیا۔ چند ہی روز بعد افلاس اپنی تنگی صورت میں تانڈ و ناچ ناچنے لگا۔ بھوک کے بھوت ہمارے گھر کی بنیادیں تک ہلاتے نظر آنے لگے۔ مجھے مجبور ہو کر کوئی کام ڈھونڈنا پڑا۔ پہلے پہل میں نے کوشش کی۔ کہ کوئی ایسا کام ملے۔ جو میری شاعری میں دخل انداز نہ ہو۔ میں نے سوچا۔ کہ کہاں کلر کی مل جانے پر مجھے شاعری کے لئے بھی وقت ملتا رہیگا (بھولا شاعر)۔ اُسے کیا معلوم کلر کی کس مصیبت کا نام ہے (میری امید کی آنکھیں ایک بار پھر اپنے امیر مداحوں پر تل گئیں۔ میں نے ان سے سفارشیں کروانا چاہیں۔ لیکن اب کی بار وہ ہڑا۔ جو پہلی مرتبہ بھی نہ ہوا تھا۔ مجھے دھتکار دیا گیا بعد ازاں مجھے اُنکی منشی مقصدیوں سے پتہ چلا۔ کہ میرے دھتکارے جانے کی بڑی وجہ میری شاعری تھی۔ میرے ان مداحوں کا خیال تھا۔ کہ ”شاعری کی لت پڑ جانے پر انسان کسی بھی کام کا نہیں رہتا۔ پھر دفتر کی ذمہ داریاں اٹھانے جو کہ کہاں سے گویا وہ آج تک میری مدح اسلئے کرتے رہے۔ کہ میں نگے سے نکلتا تر“ بنتا چلا جاؤں۔ لیکن اُس وقت میرے پاس یہ سب کچھ سوچنے کی فرصت ہی کہاں

تھی۔ بلکہ یوں کہو۔ کہ دل گر تنگی تک کی فرصت نہ تھی۔ مجھے کچھ نہ کچھ نہ کرنا تھا۔ کیونکہ چار دھم اور بوڑھی آنکھوں کے آنسوؤں اور دوشوں و حسین آنکھوں کے موتیوں کو اس فراوانی سے ضائع ہوتے دیکھنے کا مجھ میں بار نہ تھا۔ اور اس کے بعد — یہ نمک تیل کی دوکان — وہ ایک پل کے لئے رک گیا ایک لمبی سانس چھوڑے ہوئے اس نے پھر کہا اب میں سمجھ چکا ہوں۔ کہ جذبات کی روحانیت کی ندی میں نہیں بہتی۔ یہ ہے ایک شاعر کی ٹریجڈی۔

”اب مجھے گیا نو دوکاندار کہہ کر پکارنے میں کس قدر غیر شاعرانہ نام ہے — میرا نام گیا نیشور تھا۔ لیکن ایک تیل نمک بیچنے والے کو کسی خوبصورت نام سے پکارنا گویا گناہ ہے۔ اور یہ بذات خود ایک ٹریجڈی ہے۔“ وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ اسکی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ مجھ میں اٹھ آنے تک کی ہمت نہ رہی تھی۔ میں اپنی قوت کے ٹوٹنے کا منتظر تھا۔ کہ اچانک وہ پھر بول اٹھا۔

”میں نے یہی نتیجہ نکالا ہے۔ کہ شاعری بھی ایک طرح کی قومی لیڈری ہے جس میں کامیابی و ناموری حاصل کرنے کے لئے اپنی جیب میں خوب دولت چاہیے۔ مفلس لیڈر ایک گمنام رضا کار ہی رہ جاتا ہے۔ اور مفلس شاعر نمک تیل کا دوکاندار۔“

”گیا نو۔ یہ لالٹین تیل سے بھر دینا۔“ ایک ننھی سی لڑکی نے دوکان کے قطرے پر پیسہ پھینکتے ہوئے کہا۔

گیا نیشور نے نہایت حقارت کے پیسہ واپس بازار میں پھینک دیا۔ ”جا۔ جا۔ جا۔“ لڑکی اس عجیب و غریب دوکاندار کا منہ دیکھتی ہوئی پیسہ اٹھا کر چلی گئی۔

تھوڑی دیر تک گیا تو اسی کیفیت میں ہا۔ گویا کسی کو گالیاں دے رہا ہے لیکن رفتہ رفتہ برعالم بدل گیا۔ گویا اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے دوکان کے باہر سڑک کنارے اندھیرے میں آنکھیں گاڑ دیں۔ اسکے لبوں سے ایک بابو سانہ آواز نکلی۔ چلی گئی۔ ”پھر اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اُن سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے بابو۔ کہ میں دوکانداری میں بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ گویا میرا داغ چل گیا ہے۔ یہ دیکھو۔ میں نے ابھی ایک پیسے کا گاہک کتوا دیا۔ اور کیا جانے کہ یہ گاہک پھر کبھی میری دوکان پر آئے بھی یا نہیں آج صرف دو آنے پیسے دیکر دو حسین سی آنکھوں کی چمک جب مٹیالی پڑ جائیگی تو کیا میری زندگی اندھیری نہ ہو جائیگی۔ میں نے سوچا تھا۔ کہ الم پر الم اٹھانے سے شاید دل سمجھ جائے۔ اسکی انگلیں مرجائیں۔ تو میں دوکانداری میں کامیاب ہو جاؤنگا۔ لیکن یہ خیال اُسی وقت تک رہنما ہے۔ جب تک ایک حسین اور نازک بدن ملے جتنیڑوں میں میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے جب صبح دوکان پر آتے ہی وہ اوجھل ہو جاتا ہے۔ تو شاعری دیوی اُن موجود ہوتی ہے پھر جب شام آتی ہے اور گھر جانے کو تیار ہوتا ہوں۔ تو اپنی سائے دن کی کمائی دیکھتے ہی اپنی ناکامی کا احساس ہوتا ہے۔ دن بھر میں بخود کی عالم میں جو خونناہ چکانی کی ہوتی ہے۔ اُن تمام اشعار کو آگ کی نذر کر دیتا ہوں تاکہ ان جگہ کے ٹکڑوں سے زیادہ پیار نہ بڑھ جائے۔“

یہ کہتے کہتے گیا نیشور نے جیسے ایک کاغذ کا پرزہ نکال کر ڈے کی نوپر کھ دیا۔ شاید یہ اسدل کی ”شاعرانہ“ کارروائی تھی۔ مجھ میں اسکے ہاتھ سے یہ کاغذ

چھین لینے کی سکت بھی نہ رہ گئی تھی۔ البتہ جلتے ہوئے کاغذ کے ایک کونہ پر میں نے یہ مصرعہ دیکھا۔ ع

پھر وہی میں ہوں وہی صحرا وہی بربادیاں

اب بھی جب کبھی میں وہاں سے گزرتا ہوں۔ تو ”گیا نو دو کا نارا“ کو ایک کاغذ پر کچھ نکھتے دیکھ میری آنکھیں ڈبڈباتی ہیں۔ نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ آنسو گیا نو کے انجام پر بہتے ہیں۔ یا اس کاغذی پرزے کے ہونے والے انجام پر۔

شنگرگ - ستمبر ۱۹۴۱ء

مذہب

کوئی لالچ کسی قسم کا ڈر اور کوئی چھوٹی بڑی مصلحت بھی سُرجو کہ جھوٹی گواہی دینے پر مجبور نہ کر سکے۔ زمیندار صاحب کے فوراً باقی وصول کر لینے کی دھمکی بھی دی۔ لالہ کے کارندوں نے اُسے طرح طرح کے لالچ دیئے۔ لیکن سُرجو کو اس وقت گیتا کی نصیحت یاد آ رہی تھی کہ جھوٹ بولنا مہاپاپ ہے۔ اور آخر کارندوں نے لالہ کو یہی صلاح دی۔ کہ ایسے ایسے احسان فراموش بھی باتوں سے نھوڑا ہی مانتے ہیں۔ پولیس کے ڈنڈے سے خود ہی مانے گا۔ سُرجو نے اس بات کو اپنی خوش قسمتی تو تسلیم کر لیا۔ کہ زمیندار صاحب اسکے گھرائے تھے۔ لیکن جھوٹ بولنے کی اسکا مذہب اجازت نہیں دیتا تھا۔

دوسری دن اُسے گواہی دینے کے لئے جانا تھا۔ غلاف معمل وہ منہ اندھیرے

ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ بیوی کے پوچھنے پر اُس نے بتایا۔ کہ آج مجھے گو اہی مینے جانا ہے اسلئے میں آج اپنی مذہبی کتب کے اس حصے کو اچھی طرح یاد کر لیتا چاہتا ہوں۔ جہاں لکھ رہا ہے۔ کہ ہزار و شواہیاں تو کیا۔ اگر موت بھی سامنے آجائے تو بھی انسان اپنے دہرم اور سچائی کا دامن نہ چھوڑے۔

اسکی بیوی جھلائی۔ وہ جو کچھ خاوند کو سکھانا چاہتی تھی۔ وہ کسی طور سمجھتا نہ تھا۔ بیوی کو یہ دکھ کھائے جا رہا تھا۔ کہ اُسکی ہمسائیوں نے چاندی کے کڑے بنوائے تھے۔ کسی کسی نے تو گلے کی سنسلی بھی بنوائی تھی۔ کسی نے نئے کپڑے سلوائے تھے۔ لیکن اُسکی خواہشات میں ہر بار اسکے خاوند کی راست پسندی سبب راہ ہو جاتی ہے۔ وہ یہ دیکھ کر جھجھلائی۔ کہ خوشامد کرنے والے اور ایک ایک سالس میں سو سو جھوٹ بولنے والے تو مزے سے زندگی کے دن گزار رہے ہیں لیکن اسے رات کو کھانا پکانے کے لئے روز ہی کسی کا کام کر کے اٹا لانا پڑتا ہے۔ چنانچہ آج اس کے دل کے بند کھل گئے۔ وہ رو پڑی۔ لیکن اس کا دکھ بھی سدر جو کو متزلزل نہ کر سکا۔

شام کو جب سُر جو کی بیوی اپنے چھوٹے سے بیٹے کو بھوک سچپ کرانے کے لئے کہہ رہی تھی۔ تمہارے بابو شہر سے مٹھائی لائیں گے۔ کھلونے لائیں گے۔ اور بیٹا عالم تصور میں ان کھلونوں کی شکل دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ جیسی چڑیا زمیندار کے لڑکے کے پاس ہے۔ اسکا باپ اسکے لئے اس سے بڑی چڑیا لائینگا۔ اور تب زمیندار کے لڑکے کو وہ کھائیگا۔ بیچارہ نہیں جانتا تھا کہ اسکا باپ اسی زمیندار کا دست نگر تھا۔ نادان بچہ اپنے باپ کو شاید زمیندار کا سیٹھ سمجھتا تھا۔

اور اس کا باپ باہر کھڑا بچے کی یہ تمام باتیں سن رہا تھا۔ بیچ بیچ میں بھوک کے شدید زلزلے اس بچے کے خیالی محلات کو ایک سیکنڈ میں گرا دیتے۔ لیکن ماں کی بیٹھی بیٹھی باتیں پھر وہ جادو کا محل کھڑا کر دیتیں۔ اسے ہمت نہ ہڑی کہ وہ خالی ہاتھ اندر جا کر بچے کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دے۔

وہ واپس چلا گیا۔ اور اس نے زمیندار سے کٹائی کی باقی مزدوری طلب کی۔ لیکن زمیندار تو آج اس پر جلا بھنا بیٹھا تھا۔ اس نے گواہی جو زمیندار کے حق میں نہیں دی تھی۔ پولیس افسر کے سامنے تو وہ اُسے کچھ کہہ نہ سکا۔ اسی لئے دوسرے دن کی تاریخ لے لی۔ اور اب سوچ رہا تھا کہ اسکی گواہی کیسے لوائے اسے دیکھ کر اور پھر اس کے مزدوری مانگنے پر تو اسے آگ سی لگ گئی۔ اس نے جوتے لٹو کر باہر نکال دیا۔ وہ پھر واپس آیا۔ اور اب کی بار اسکے گھر میں بھوک کی ایک ایسی آندھی چل رہی تھی۔ جس کے سامنے فقور کا کوئی بھی محل کھڑا نہ رہ سکا۔ کھلنے سے کھیلنے کے خیال بھی تیز ہوا میں اڑ گئے۔ لڑکا بھوک سے بے چین ہو کر تڑپ رہا تھا۔ اور اب تو باپ کو کوس رہا تھا کہ وہ جلدی کیوں نہیں آتا۔ اس کی بیوی رو رہی تھی۔ اور ان دونوں کے آنسوؤں نے سُر جو کے دل میں ایک ندی بہا دی، دکھ کی۔ اور دھیرے دھیرے اس ندی میں بادھ لگئی۔ اور اتنے زور کا طوفان آیا کہ وہ اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گیا۔ سُر جو کا غم عبیم بھی بہہ گیا۔ وہ بے نخواستہ زمیندار کے گھر کی طرف بھاگا۔ اور گواہی کا وعدہ کر کے اس سے چند روپے بھی لے آیا۔

دوسرے دن وہ پہرہ دن چڑھے تک بھی چارپائی سے نہیں اٹھا۔ آج

پہلا دن تھا۔ کہ اس نے مندر جانے سے ناغہ کیا۔ اس کی بیوی نے اسے بار بار جگایا۔ وہ یہ کہہ کر پھر لیٹ جانا۔ صرف کچھ ہی ہی تو جانا ہے۔ دس بجے اٹھ کر چلا جاؤنگا۔ اس کی بیوی نے ایک بار پوچھا۔ آج آپ مندر بھی نہیں گئے۔ گیتا کا پاٹھ بھی نہیں کیا۔

وہ مندر کا نام شکر اٹھ بیٹھا۔ اور ہنسنے لگا۔ ایک بے معنی سی ہنسی۔ اور پوچھنے لگا۔ آخر مندر اور گیتا کی کیا ضرورت ہے؟ بیوی بولی۔ کچھ مذہب کا بھی خیال ہے یا نہیں؟ وہ ہنسا۔ اس کے منہ سے نکلا۔ ”مذہب“ اور اپنی جیب کے چند روپے اس نے زور سے چھینچنا دیئے۔

۱۹۳۹ء
لاہور۔ مئی

دُکھیا کا ہمدرد

پائین باغ کی چار دیواری کے باہر سے کسی کے کراہنے کی آواز آرہی
 تھی۔ رئیس اعظم چیل قدمی کرتے کرتے رُک گئے۔
 بد چوہدار۔ دیکھو باہر یہ کون منخوس ہے۔ سوئیے سوئیے۔

سیرکامزہ کر کے کرا کر دیا۔
 اور باہر وہ گداگر جانے کب سے اُس چھوٹے اونچی دیوار کے سائے
 میں پڑا کر رہا تھا۔ رات بھر کسی نے اس کی آواز نہیں سنی۔ سننا بھی
 کون۔ وہ باغ کی دیوار کے سائے میں تھا نہ۔ جو اُس باغ میں ٹہکتے ہیں۔ وہ
 رات کو جاگتے نہیں۔ اور جو رات کو جاگتے ہیں۔ انہیں باغوں میں ٹہکنے کی
 فرصت نہیں ہوتی۔ اس کی آواز سننا کون۔ رات بھر کھلے ہیں پڑا ہونے کے

باعث اس کا جسم سردی کے ماسے اگڑ گیا تھا۔ بلکہ بدن کا بندر بندر و در و در رہا تھا۔ اس پر دس روز کا فاقہ۔ در و در کہتا تھا کہ زبان کھول لیکن بھوک کے سبب رگوں میں کچھ ایسا شخ پیدا ہو گیا تھا کہ منہ کھل کر رہ جاتا۔ زبان نہ کھلتی۔ حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکل جاتی۔ جو اُس چھ فٹ اونچی چار دیواری سے ٹکرا کر اُسی کے کانوں کی راہ پھر اُسی دل میں سما جاتی۔ جو پہلے ہی در دوالم سے بھرا ہوا تھا۔

چو بدرا آیا۔ اور چلا گیا۔ اُس اس کی آواز کس نے سن لی۔ کوئی پوچھنے تو آیا۔ خواہ وہاں سے فوراً اٹھ جانے کا حکم لے کر آیا۔ دل نے کہا شک ہے کسی نے پوچھا تو۔ اب دل میں یہ حسرت تو نہ رہے گی۔ کہ کسی نے پوچھا تک نہیں۔ اب یہ الطینان تو ہے۔ کہ اُس کا کراہنا کوئی سنتا ہے اسی کامیابی کی خوشی میں اُس نے زور سے کراہنے کی کوشش کی۔ لیکن بھوک سے نڈھال ہو کر اُس کی آواز گلے ہی میں بیٹھ گئی۔ فاقہ کشی کی شدت نے اُسے بیہوش کر دیا۔

”چو بدرا۔ وہ کون تھا۔“

”حضور ایک گداگر۔ کہتا تھا۔ دس دن سے بھوکا ہوں۔ سردی کے

سے اُمید کیا ہوں۔“

رئیس اعظم کے چہرہ کے خطوط کچھ اس طرح اُسے ترچھے ہو گئے۔ گویا کسی نے خمارت و نفیس کے الفاظ تراش دیئے ہوں۔ ان لوگوں کا تو کسب ہی یہی ہے۔ تمہیں نقلی اور اصلی کراہنے کی پہچان بھی نہیں۔ دیکھا جب اُسے پتہ

چلا۔ کہ ان تلوں میں نیل نہیں۔ تو کس طرح چپکا ہو گیا۔ سو بیرے
 سو بیرے۔ کوئی رام کا نام چیتا ہے۔ کوئی کچھ۔ ساور یہ آیا ہے دکھڑا
 سنانے جانے آج دوکانداری کیسی ہے گی

رُئیں عظم صبح چار بجے کے قریب پیشاب کی غرض سے اٹھے باہر ہیں
 سے کسی کے کراسے کی آواز آرہی تھی۔ آواز انکی پہچانی ہوئی تھی۔ انہیں سب
 کام بھول گئے۔ آنکھوں سے بند ہوا ہو گئی۔ اپنا سمور کا کبیل لینا بھی یاد نہ رہا۔
 دروازہ کھولا۔ اور ننگے پڈے ہی باہر کی جانب لپکے۔ کوٹھی بھر میں کہرام مچ گیا
 نوکر چاکر گھبرائے ہوئے بھاگے بھاگے پھرتے تھے۔ کہیں برائڈی لائی جا رہی
 تھی۔ اور کہیں روٹی۔

سیٹھ صاحب خود انگلیٹھی میں کوٹھے پھونک رہے تھے۔ انہوں نے اپنے
 ہی بستریں اُسے لٹا دیا تھا۔ دوکان جانے کا وقت گزر چکا تھا۔ لیکن جب تک
 ڈاکٹر نہ دیکھ جائے۔ انہیں چین کہاں۔ بار بار اس کے منہ کی طرف دیکھتے تھے۔ وہ
 رات بھر سردی میں باہر ٹھٹھرتا رہا۔

نوکر چاکر ایک دوسرے سے کہتے پھرتے تھے۔ اتنے دیوان سیٹھ میں
 کہ کسی کا دکھ تو اُن سے دیکھا ہی نہیں جاتا۔

ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کیا۔ سیٹھ صاحب کی آنکھیں بار بار بھرتی
 تھیں۔ ڈاکٹر صاحب۔ ذرا اچھی طرح دیکھئے گا۔ یہ بڑا برکت والا جیرو ہے۔
 میرے تو گھر کی رونق ہی اسی سے ہے۔

ڈاکٹر نے نہایت سنجیدگی سے کہا: گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سٹیٹ
 صاحب اسے ذرا سردی لگ گئی ہے۔ شام تک ٹھیک ہو جائیگا۔
 جیب میں فیس ڈالتے وقت اس نے پھر تسلی دینے کی غرض سے کہا۔
 یقین رکھئے۔ آپ کا البیاقیمتی کتنا ہیں اس معمولی سی تکلیف سے ضائع نہیں
 ہونے دوں گا۔ آپ کی آنکھیں کلیجہ ڈبڑا رہی ہیں۔
 کیا کروں۔ ڈاکٹر صاحب۔ کوئی دکھیا تو مجھ سے دکھیا بھی نہیں جاتا۔

لاہور۔ مئی ۱۹۳۹ء

وزیر اعظم

جنگ کا نام سنتے ہی ہر ایک کے دل میں ایک آگ بھبک اٹھی تھی۔ راجپوتی
خون رگ رگ میں کھول رہا تھا۔ گنیش گڑھ کے نوجوان مہاراج کی سالگرہ کے
جشن میں شرکت کے لئے دیاست بھر سے بائکے راجپوت راجدھانی میں آئے
ہوئے تھے۔

راجدھانی کا کوٹا کوٹا جگہ گاہا تھا۔ اسکے ہر رُبن موسے مستی پھوٹی پڑتی
تھی۔ اسکی سیج و سج ایسی تھی۔ جیسے کسی نئی نویلی دلہن کی۔ لیکن بہادر راجپوت
ہمیشہ سے جنگ کی خاطر اپنی نویلی دلہنوں کو انکے گھونگھٹ تک اٹھائے بغیر
چھوڑتے آئے ہیں۔

جنگ ————— جنگ انکے لئے شہرِ ماور سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ انکی زندگی کا ایک ایسا جزو۔ جسکے بغیر انکی مردانگی۔ انکی دلاوری بلکہ خود ان کی زندگی بھی اکارت تھی۔ انہیں جنگ کی وجہ پہنچنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ ————— بات بات پر میان سے تلواریں کھینچ لینا انکے لئے روزمرہ کا معمول تھا۔

وزیرِ اعظم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ”چنٹ پور ایک بڑی ریاست تھی لیکن راجپوت اپنی آن سے بڑا اور کسی شے کو نہیں جانتے۔ اور اسی آن کے لئے ہمیں چنٹ پور تو کیا۔ اس سے بھی بڑی طاقت سے بھر جانے میں جھجک نہیں۔“

اور۔ مجمع میں ایک بھی آدمی ایسا نہ تھا جو یہ پوچھتا کہ ”آخر کیوں ہمیں جنگ کی بھٹی میں جھونکا جا رہا ہے۔ دونوں ریاستوں میں کون سی ایسی وجہ ہے جو سلجھاٹی نہیں جاسکتی۔“

دیاں اتنا پوچھنے کی فرصت ہی کسے تھی۔ جوش کی ایک ہی لہر تھی جو مجمع کے اس چھوٹے پرے چھوٹے بڑھتی چلی گئی تھی۔

گو یا مجمع کے مختلف اندر ایک ہی دل کے ٹکڑے تھے جن میں جنگ کا لفظ سنکر ایک ہی ساتھ جوش ابل پڑتا تھا۔ وہ راجپوت تھے جنہیں جنگ شہرِ ماور سے بھی زیادہ عزیز تھی۔

وزیرِ اعظم اپنے محل کو لوٹ رہے تھے۔ انہوں نے اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔

آنے والے خطرہ سے عوام کو آگاہ کر دیا تھا۔ انہوں نے اس فلیٹے کو آگ لگا دی تھی۔ جس کا دوسرا سرا بارود کی کوٹھڑی میں کھلتا ہوا۔ چند منٹے — اور اسکے بعد جنگ۔ ایک خونریز جنگ۔ جس میں خون کی ندیاں بہ نکلیں گی۔ ندیاں..... جن کا پاٹ اس ریاست سے اُس ریاست تک پھیلا ہوا ہوگا جن کی بھیانک لہروں میں بہت سی نوبلی دہنوں کے سہاگ ڈوب جائیں گے۔ دہنتیں — جنہیں یہ حسرت رہ جائیگی۔ کہ کوئی ایک بانفوان کا گھونگھٹ اٹھا کر کہے۔

”یہ نظریں زمین میں کیوں گڑی ہوئی ہیں۔ انہیں تیروں کیلئے تو تم نے سینہ سپر کر رکھا ہے اور پھر ٹھوڑی پکڑ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھیجے ہو۔ لبوں پر دو انکائے سے رکھ دے۔“

اکثر دہنوں کے دل میں یہ حسرت رہ جاتی رہی ہے۔ بہادر راجپوت ہمیشہ سے جنگ کی خاطر نوبلی دہنوں کو اسٹے گھونگھٹ تک اٹھائے بغیر چھوڑنے آئے ہیں۔

”گنیش گڑھ کے بائیں لڑائی کی وجہ پوچھنا نہیں جانتے۔ جنت پور والوں نے جانے کیا سمجھ رکھا تھا۔ انکی راہکاری کا رشتہ قبول نہ کرنے سے اگر ان کی ہدایت ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے بے عزتی کا بدلہ جنگ میں لینے پر تلے ہوئے ہیں۔ تو ہم نے کون سی چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔“ — راہکاری کا رشتہ..... وہ نہیں جانتے۔ کہ گنیش گڑھ کی رانی وزیر اعظم کی اکلونی لڑکی اناکشی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ وہ نوجوان مہاراج کے دل میں بس چکی

ہے۔ اگر حجت پر ولے اسکے لئے جنگ لڑینگے۔ تو آئیں۔۔۔۔۔ ہمارا بچہ
بچہ اپنی آن پرکٹ مر گیا۔ راجپوت اپنی آن سے بڑی اور کسی شے کو
نہیں مانتے۔“

وزیر اعظم کے خیالات ایک ساعت کے لئے منتشر ہو گئے۔ سامنے
پنگھٹ پر جوان لڑکیاں جھرمٹ بنائے بیٹھی تھیں۔ وہ پانی لینے آئی ہوئی تھیں
چند ایک کی بلورین کلائیوں میں سرخ رنگ کی چوڑیاں بتا رہی تھیں۔ کہ
ان کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ وہاں ایسی کنواریاں بھی تھیں۔ جو شادی کی
باٹ دیکھ رہی تھیں۔ شادی شدہ لڑکیاں جب ایک دوسرے کی طرف
دیکھتیں تو انکی نگاہوں میں ایک عینتی راز ہوتا۔ جسے دیکھ کر کنواریاں ایک
سانس بھرتیں۔ انکی چولیوں پر سلوٹیں پڑی دیکھ کر کنواریوں کے سینوں میں
دل مچل مچل جاتے۔ انکی چوڑیوں کی چھنک سنکر وہ اپنے خالی ہاتھوں کو بہتے
پانی میں ڈبو کر زور زور سے ملنے لگ جاتیں۔

یہ سرخ چوڑیوں کی چھنک ہی تھی۔ جس نے وزیر اعظم کی توجہ اپنی طرف
کھینچ لی تھی۔ لڑکیاں اپنی سرخ چوڑیوں کو دھو رہی تھیں۔ کیا جانے کہ چند ہی
ہفتوں بعد ان میں سے کئی ایک کی چوڑیوں کی سرخی کسی کا خون بن کر رہ جائے
پھر وہ بھی کسی کی سرخ چوڑیوں کی چھنک سنکر اپنے خالی ہاتھوں کو بہتے پانی
میں ڈبو کر زور زور سے ملا کر بیگی۔ یہ کنواریاں جو کسی کے دوہا بنگرانے کی
راہ دیکھ رہی ہیں۔ کیا جانے ان میں سے کس کس کے دوہا بنگرانے
والے وہ “خون کی اُس ندی میں ڈوب جائینگے۔ جس کا پاٹ گیش گرہ

سے چنت پوز تک چوڑا ہو گا۔ اور ان میں سے کئی اس ندی میں ڈوب
 مرے گی۔ ریاست بھر کی کنواریوں میں سے کتنوں کا یہ حشر ہو گا۔ اور اس کی
 اناکشی وہ گنیش گرٹھ کی رانی بنے گی۔ اس کو رانی بنانے
 ہی کے لئے تو یہ سب کچھ کیا جائیگا۔ وہ اس کی اپنی لڑکی ہے نہ۔
 اکلوتی لڑکی۔ اور یہ لڑکیاں۔ ریاست بھر کی
 لڑکیاں۔

..... جن کی چوڑیوں کی سُرخ کسی کا خون بن کر بہ جائے گی۔
 ناکہ اس کی اناکشی سُرخ چوڑیاں پہن سکے۔ اور اس کی سُرخ چوڑیوں
 کی چھنک سُنکر ریاست بھر کی جوان لڑکیاں اپنے خالی ہاتھوں کو بہتے پانی میں
 ڈبو کر زور زور سے مل لیا کریں۔ اناکشی ریاست کے وزیر اعظم کی
 لڑکی ہے نہ۔ لیکن کیا وزیر اعظم ریاست بھر کی لڑکیوں کا باپ
 نہیں ؟

بوڑھے پریشان کا دماغ دھندلا گیا۔ اس نے گھوٹے کی باگ کھینچ لی۔ پیچھے
 نیچے آنے والے سپاہی گردنیں بڑھا بڑھا کر دیکھنے لگے کہ وزیر اعظم کیوں
 رک گئے ہیں۔ لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔ دورِ اُفق سے پرے کسی آنے والی آندھی
 لے آتا روکھائی دے رہے تھے۔

(۲)

پردھان کا گھوڑا پھر بڑھا۔ سامنے ندی کنارے ایک ننھا بچہ چل گیا تھا۔
 اس نے پردھان کا گھوڑا دیکھا۔ نوغدا کرنے لگا۔ کہ میں بھی گھوڑے پر چڑھوں گا۔

سے کانپ گیا۔ اس کا گھوڑا پھر رک گیا۔ اس کا دل قطعی فیصلہ کرنے سے ابھی جھجک رہا تھا۔ بچا اب بھی چل رہا تھا۔ اسکی ماں سوچ رہی تھی کہ یہ اس وقت چپ کیسے کرے۔ ”وزیر اعظم سوچ رہے تھے کہ اسکا مستقبل کیا ہوگا۔“

اچانک وسط دریا سے چیخوں کی آواز آئی شروع ہوئی۔ ایک کشتی میں چھوٹے چھوٹے بچے پار جا رہے تھے اس کا گھوڑا سجانے کس طرح پانی میں گر گیا تھا۔ اور اب کشتی چڑھتی ہوئی ندی کی طوفانی لہروں کے رحم و کرم پر تھی۔ اس وسیع اور پر آشوب دریا میں اُنکا کوئی سہارا نہ تھا۔

وزیر اعظم نے یہ دیکھا کہ اسکی آنکھوں کے سامنے اپنی ریاست کے بچوں کا مستقبل آگیا۔ وہ زیادہ دیر یہ نظارہ نہ دیکھ سکا۔ اور اس بات کا فیہر خیال کئے بغیر کہ اسکے بوڑھے بازوؤں میں وہاں تک پہنچنے کی سکت بھی ہے یا نہیں۔ اور کہ اس کے ڈوب جانے کے بعد انکشتی کا مستقبل کیا ہوگا اس نے ان بچوں کو بچانے کے لئے دریا میں جھلانگ لگا دی۔
 اُفتی سے اب تک آندھی کے آثار مٹ چکے تھے۔

(۳)

مہاراج مانتے نہیں تھے۔ لیکن پر دھان انہیں مجبور کئے تھے۔ کہ وہ بنت پور کی راجکاری سے بیاہ کر لیں۔ نوجوان اور سندرمہاراج نے وزیر اعظم سے پادوں تک یرے غور سے دیکھا۔ وہ چھ فٹ لمبا گورا بدن آج جھجکا جھجکا

تھا۔ اسکی بڑی بڑی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اور آنکھوں میں بے خوابی کی علامتیں صاف ظاہر تھیں۔ جو زبان محض حکومت کے لہجہ میں بات کرنا جانتی تھی۔ آج اس طرح بول رہی تھی جیسے تھک گئی ہو۔ لیکن آہستگی نے کلام کی روانی پر کوئی اثر نہ ڈالا تھا۔ وہ روانی جو استقلال کی مظہر تھی مہاراج حیرت کے مائے بت بنے اسکی یہ بات دل میں دھرانے لگے۔ کہ ”فرض اور ذمہ داری کا احساس مجھے مجبور کر رہا ہے مہاراج۔ کہ میں آپ کو صاف صاف بتا دوں۔ کہ صرف ایک آدمی کی خوشی کے لئے ہم ہزاروں بیگناہوں کی جانیں قربان نہیں کر سکتے۔“

مہاراج سوچنے لگے۔ کہ یہ بات وزیر اعظم اپنے منہ سے کیسے کہہ رہے ہیں۔ یہ شخص جس کی اکلوتی لڑکی میری رانی بننے والی ہے جو یہ جانتا ہے۔ کہ میرے دل سے اناکشی کو اودا اناکشی کے دل سے مجھے کبھی جدا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سب کچھ جانتا ہے۔ اور پھر بھی مجھے اناکشی کی طرف سے منہ موڑ لینے کو کہہ رہا ہے بوڑھا پروہان۔ یہ سبھی تو نہیں گیا۔ کہیں یہ اناکشی کی شادی کسی اور جگہ تو نہیں کرنا چاہتا۔ اور کیا اناکشی بھی یہ مان جائیگی۔۔۔۔۔ نہیں پروہان کو ہماری محبت کا اچھی طرح علم ہے۔۔۔۔۔ ورنہ وہ جشن والے دن نوجوانوں کو جنگ کے لئے تیار رہنے کی تلقین نہ کرتا۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ میری سست کا بچہ میرے لئے کٹ مرنے کو تیار ہے۔ میں اناکشی کے لئے جنت پور تو کیا ہمالیہ سے بھی مکر لاسکتا ہوں۔

پروہان نے مہاراج کا قطعی فیصلہ سنا۔ تو اسکی آنکھیں نم آلود ہو گئیں

اس کی آنکھوں کے سامنے پگھٹ پر بیٹی ہوئی اُن لڑکیوں کا نظارہ آگیا۔ جو کسی کی سُرخ چوڑیوں کی چھنک سُنگھ اپنے خالی ہاتھ بہتے پانی میں ڈبو کر زور زور سے ملنے لگ جاتی ہیں۔ پھر وہ بچہ جو اس انتظار میں ہے کہ اس کا باپ سونے کا گھوڑا لیکر ابھی آئیگا۔ اور سچوں سے بھری ہوئی وہ ناؤ۔ جس کا کھویا دریا میں گر گیا ہے۔

وہ چپ چاپ اٹھا۔ اور راج محل سے نکل آیا۔

(۴)

مہاراج نے ایک بار دوبار۔ تین بار اور پھر کئی بار وہ خط پڑھا۔ اُن کا دماغ شل ہو گیا۔ وہ خط ہاتھ میں لئے لئے فحیل پر گئے۔ جہاں سے دور دور تک انکے راج کی دستقیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اور انکی آنکھیں کہیں بہت دور جنگلوں میں جانے والے دو مسافروں کی ناکام تلاش کمر رہی تھیں۔ جن میں سے ایک الہڑ حسینہ بار بار پاؤں میں کانٹے چھب جانے سے آنکھیں بھرلاتی ہے۔ لیکن اگر اسکے آنسو کا نٹوں کی چھن سے پیدا ہوتے ہیں۔ تو اسوقت ہی کیوں آنکھوں سے بہ نکلتے ہیں۔ جب وہ کاٹنا نکالنے کے بہانے مڑ کر مجھے کو دیکھتی ہے۔

مہاراج کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ انہوں نے ایک بار پھر خط پڑھنا شروع کیا۔ گو یا خود وزیر اعظم ایک گمبھیر آواز میں بول رہے تھے۔

”ایک روز انا کشتی میں جا بیٹھی۔ اور آپ بھی۔ لیکن دیش۔ یہ دیش ہمیشہ زندہ رہیگا۔ اپنے دیش کو اُس لڑکی کے لئے برباد نہ کیجئے۔ جس کی حیات چند روزہ ہے“

آپ اس سے برعکس کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہمیں ویس چھوڑنا پڑا۔ انکشتی کے ہاتھ بجلے ہی خالی رہیں۔ لیکن یاست بھر کی جوان لڑکیوں کی سُرخ چوڑیاں چمکتی رہیں۔ یہی میری پرارتھنا ہے۔

(۵)

شہر کے لوگ آتے تھے۔ اور سر جھکا کر چلے جاتے تھے۔ نامزدوں کو وہاں ملاوٹی تھی۔ سُرخ چوڑیاں پہنے نو بیاہتا لڑکیاں وہاں اسلئے آتی تھیں کہ انہیں اٹل سہاگ ملے۔ کنواریاں وہاں من چاہا بیروانے کے لئے منتیں مانتی تھیں۔ بچے آتے تھے۔ کہ کھلونوں والی دوکان سے سونے کا گھوڑا لے جائیں۔ اور تو اور خود مہاراج وہاں سر نہانے آتے تھے۔ اور وہ ان سب کی طرف دیکھتا ہوا کھڑا تھا۔ لبوں پر ایک خاموش مسکراہٹ تھی۔ اسکے پاؤں تلے ایک پتھر پڑا ہوا تھا۔ قربانیوں کا ساگر تھا۔ اور وہ ان سب پر مسکراتا رہتا تھا۔ بوڑھے چچا کا بت۔ ریاست کے کونے کونے میں اس کی حدیم المثال قربانی کا چرچا تھا۔ عوام کے نزدیک وہ ایک دیوتا بن گیا تھا۔ جس کی منت ماننے سے ملاویں پوری ہوتی تھیں۔ غریب عوام کے پاس کسی کی قربانی کی قیمت ادا کرنے کے لئے عقیدت کے سوا اور ہے ہی کیا۔ چنانچہ شہر کے لوگ آتے تھے۔ اور سر جھکا کر چلے جاتے تھے۔ اور وہ ان سب کی طرف دیکھتا ہوا کھڑا تھا۔ لبوں پر ایک خاموش مسکراہٹ تھی۔

”ترخ“..... اس زور سے پتھر لگا۔ کہ بت کا ایک حصہ ٹوٹ گیا۔

لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ عقیدتمندوں کی بھوس تن گئیں۔ اور وہ پاگل
ایک طرف کھڑا پیر و جان کو کالیاں دے رہا تھا۔ ایک وحشت ناک بیٹھت کا انسان
بے ترتیب دائرہ ہی بکھری ہوئی۔ سر کی خشک اور پریشان لٹوں میں تپتے پھنسے
ہوئے۔ آنکھیں گویا اپنے خانوں سے باہر گری پڑتی تھیں۔ سب لوگ اس کی
طرف پل پڑے۔

وہ وحشیوں کی مانند ہنسنے لگا۔ اور پھر ہنسنے ہنسنے رو پڑا۔ روتا
رہا اور پھر ہنس پڑا۔ خمد سے پھرے ہوئے لوگوں کے ہاتھ میں جو آیا۔ اُس پر
مے مارا۔ دھول۔ دھپا۔ مٹکا۔ لات۔ جوتا
ڈنڈا۔ گالی۔ گلوچ۔ غرضیکہ اُس پر ہر
طرح کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ وہ ہنستا رہا۔ اور روتا رہا۔ بت کے لبوں پر اب
بھی ایک خاموش مسکراہٹ تھی۔

مہاراج نے تھلا کر پوچھا۔ ”وہ کون ہے جس نے ہمارے دیوتا
کی بے حرمتی کی ہے۔“ ”ایک پاگل۔“ مہاراج ”مہاراج نے
میان سے اپنی تلوار نکال لی۔
”بیٹے جاؤ۔ اور اسی کے ساتھ اس کا قتل کر کے لاؤ۔“

پاگل نے ایک خط لکھ کر مہاراج کے پاس لے جانے کو کہا۔ اور خود ہنس مٹھا
مقتل کی جانب چلا گیا۔

مہاراج نے پڑھا۔ میں ہنستا ہوں اسلئے کہ لوگ ایک پاگل کو دیوتا مان
 بیٹھے ہیں۔ جو دنیا کے جھوٹے فرضوں کے دھوکہ میں اپنی اکلوتی خوشی کا گلا گھونٹ
 لے۔ وہ پاگل نہیں تو اور کیا ہے۔ اور یہ جاہل اُسے دیوتا مانتے ہیں۔
 میں رو پڑتا ہوں۔ کہ انا کشتی میری غلطی کے باعث کھل کھل کر مر گئی۔ وہ کلی پھول
 بننے سے پہلے میرے سخت ہاتھوں میں پھلی گئی۔ میں اس سے بھی زیادہ سزا کا
 مستحق ہوں۔“

مہاراج نے پکار کر کہا ”جاؤ اُسے بچاؤ۔“
 جو سپاہی مہاراج سے پوچھنے آیا کہ ”کسے مہاراج؟“ اس کے ہاتھ میں
 ایک کپڑا تھا۔ جس میں خونی سے لٹھڑا ہوا ایک سر لٹپا ہوا تھا۔

لاہور۔ جولائی ۱۹۳۸ء

(یہ افسانہ آل انڈیا ریڈیو سے براڈ کاسٹ کیا جا چکا ہے)

باسٹھ پیسے

ساتھ ہو گئی۔ دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ لالو کے ٹوکے
میں کچھ پھل بیچے ہوئے تھے۔ اس کی نگاہیں بازار کے اس سرے سے اُس سرے
تک پھر گئیں۔ خال خال کوئی چلنے والا نظر آتا تھا۔ ان میں سے اسکے پھل کون
خریدے گا۔ شاید وہ بالچونگے سر آ رہا ہے۔ وہ اسی کی جانب دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ بابو
اسکے قریب آ گیا۔ اسکا دھیان دوسری طرف تھا۔ لالو نے زور سے ہانک لگائی۔
”چمن کے میوے“

لالو نے ایک بار اسکی طرف دیکھا۔ اور ختم ہوتے ہوئے سگریٹ کا ایک لمبا
کش کھینچ کر بچا ہوا ٹکڑا وہیں پھینکا۔ اور چلا گیا۔ لالو اُسے دیکھتا رہا۔ نیبہ بابو کہاں
سے خریدتا۔ ایک سگریٹ نوش اگر نیپوں پہنے ہوئے ہو۔ اور پھر پیدل چلے گا

بازار خالی ہو چکا تھا۔ لالو نے اپنی چھابڑی سر پر اٹھائی۔ اور اپنی جیب
 ہی جیب میں پیسوں کو گننے کی کوشش کرتا ہوا چل پڑا۔ آج اُس نے دل میں
 فیصلہ کر رکھا تھا کہ جتنے بھی پیسے ایک روپے سے زیادہ ہونگے۔ وہ اپنے اکلوتے
 چنو کو روٹی کھلانے کیلئے مخصوص کر دینگا۔ آج وہ چنو سے پکا وعدہ کر کے آیا تھا
 اور وعدہ نہ کرتا بھی کس طرح۔ کل شام سے چنو بھوکا ہے۔ اُس نے پھل کھانے
 سے انکار کر دیا ہے۔ ہر روز پھل ہر روز پھل۔ میں اب پھل نہیں کھاؤنگا۔ اُس
 نے آنسو بھری آنکھوں سے یہ فقرہ کہا تھا۔ اور باپے جھپٹ گیا تھا۔ اسکے سامنے
 تو نہیں۔ البتہ علیحدہ ہو کر لالو خود بھی رو دیا تھا۔ وہ بچے کو یہ یقین نہیں دلا سکا
 تھا۔ کہ پھل دنیا کی بہترین غذا ہے۔ جس کے لئے امیروں کے بچے گھروں میں لٹتے
 جھگڑتے ہیں۔ لیکن چنو کی دلیل بھی قاطع تھی۔ آخر وہ شے بہترین غذا کیسے ہو سکتی
 ہے۔ جس کے بدلے ایک بدتر کھلانے والی غذا میسر نہیں آ سکتی۔ ساری دنیا
 وہی بدتر غذا کھاتی ہے۔ وہ بھی وہی کھاٹیکا۔ پھل نہیں کھائے گا۔
 بچے کی باتیں سنکر لالو کو یہ یقین ہو گیا۔ کہ امیروں کی امارت بھی جب کنگال کے
 گھر پہنچتی ہے۔ تو افلاس کی دلیل بن جاتی ہے۔

تنور والے کی دوکان کے سامنے ہی بجلی کا کھمبا تھا۔ اسی کے نیچے کھڑے
 ہو کر لالو نے اپنی جیب سے تمام پیسے نکال کر گنے۔ پورے باسٹھ تھے۔
 باسٹھ۔ ایک پیسہ بھی پورا نہ ہو سکا۔ ایک لمحے کے لئے وہ چنو اور اسکی روٹی کا خیال
 بھولی گیا۔ اُسے کل کی فکر نے آگھیرا۔ کل۔ کل نے پھل کہاں سے لائیگا۔

میوہ منڈی میں ایک روپے سے کم والے گاہک کو تھوک کے بھاؤ پر پھل نہیں مل سکتے۔ پھر۔ یہ دو پیسے کی کمی۔ یہ کون پوری کرے گا۔ کون۔ اُس کا کون ہے وہ فقیر ٹھیک ہی گایا کرتا ہے۔

”اس جگہ میں ہے اپنا کون۔“

کوئی نہیں جو دو پیسے کی کمی پوری کر دے۔ اسکی جس منتھیلی میں پیسے تھے اُسی پر آنسوؤں کے دو قطرے اُپڑے۔ آنسو۔۔۔۔۔ جن کا بے منتھدانی منتھیلی کے ایک طرف بہ گیا۔۔۔۔۔ کاش۔ وہ خون کے دو آنسو ہوتے۔ جو پھیلنے پھیلنے سرخ تانبے کے دو گول ٹکڑے بن سکتے۔۔۔۔۔“

تنور والے نے پوچھا۔ کیا چاہیئے۔۔۔۔۔ ”جواب کی بجائے لاؤ لے بھی سوال ہی کیا۔ آپ کو پھل چاہئیں۔۔۔۔۔“

”ہمارے پاس فالتو پیسے نہیں۔“ تنور والا اپنے کام میں منہمک تھا۔ لاؤ کچھ دیر رک کر بلا۔۔۔۔۔ ”دور روٹیوں ہی سے تباؤ کر لو۔“

”ہا۔ ہا۔ ہا۔“ تنور والا اپنے کالے ننگے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر قہقہہ لگاتا ہوا کہنے لگا۔

”روٹی سے ہمارا پیٹ بھرتا ہے۔ ان پھلوں سے نہیں۔“

لاؤ بہت دیر میں گھر پہنچا۔ چنوا بھی سویا نہیں تھا۔ بھوکے پیٹ بند نہ کی نہیں آتی۔ اُس نے اٹھتے ہی باپ کی چھاڑی دیکھی۔ اور رونی صورت بنا کر پوچھا۔

”آج بھی روٹی نہیں۔۔۔۔۔“

”کیوں نہیں بیٹا۔۔۔۔۔“

”تو کہاں ہے۔۔۔۔۔؟“

”لاؤنے اپنی جیب سے باسٹھ پیسے نکال کر بیٹے کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ چٹو نے

خوشی کے مارے کہا ”یہ سب۔۔۔۔۔“

”ہاں۔ یہ سب۔ جتنے چاہے خرچ کر۔۔۔۔۔“ بیٹے نے پُر امید لہجے میں

پوچھا ”اسکے بعد پھر اور ملیں گے۔۔۔۔۔“

”لاؤ محض اتنا ہی کہہ سکا۔۔۔۔۔ اسکے بعد۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔“ اور پھر

وہ ہنس پڑا۔ چٹو نے پوچھا۔

”کیا ہوا بالو۔۔۔۔۔“

”ہوا نہیں۔۔۔۔۔ ہوگا۔“

باہر گھنے بادلوں کے باعث گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ اچانک ٹکڑا کا ٹکڑا

ہوا نہ بجلی گدھی۔ اور ایک قفر بی درخت اپنی شاخوں سمیت جل کر خاک ہو گیا۔

لاہور۔ اپریل ۱۹۳۹ء

بیکار
(ایک تیشیل)

۷-۷-۷۷

اندروڈرامہ

نوجوان ایک تعلیمیافتہ بیکار
کلا نوجوان کی بیوی
ڈاکٹر ایک مسافر

پہلا منظر

نوجوان کے مکان کا اندرونی حصہ۔ کلا ایک چارپائی پر لیٹی ہوئی ہے۔
(نوجوان کی آمد)

نوجوان ”کلا“.....
 کلا ”آپ آگئے..... بہت دیر کر دی“
 نوجوان ”آج بہت بھگتا پڑا..... بڑے صاحب کی کوٹھی....“
 کلا ”نہیں۔ نہیں یہاں بیٹھے“
 نوجوان ”نہیں تم لیٹی رہو۔ بیماری میں اٹھنا اچھا نہیں“
 کلا ”آپ بیٹھے تو۔ میں اچھی ہوں“
 نوجوان ”ہاں۔ تو میں بڑے صاحب کی کوٹھی پر..... اسے یہ کیا۔
 پاؤں کیوں دباتی ہو۔ میں اتنا نہیں نکھا۔ اور پھر پہنے اپنا شبر یہ تو سنبھالو“
 کلا ”میرا شبر اچھا ہے۔ آپ سناٹے۔ پھر بڑے صاحب کے کیا کہا“
 نوجوان۔ اول تو اسکی کوٹھی کا پتہ ہی نہ ملتا تھا۔ پھر پتہ چلا۔ بہت دیر ہاں
 ماڈل ٹاؤن کے پاس کہیں ہے۔ وہاں جا کر بیٹھا رہا۔ بہت دیر بعد صاحب باہر
 نکلا۔ میں نے عرضی پیش کر دی۔ اس نے پڑھے بغیر لٹا دی“
 کلا ”پھر۔ آپ؟“

نوجوان ”میں نے سن رکھا تھا۔ صاحب سخت تو ہے لیکن دل کا کھٹا نہیں
 زبانی عرض کیا۔ صاحب بیوی بیمار ہے۔ ایک چھوٹا بچہ بھی ہے جیسا ویسا کام
 ہو۔ وہی دلوا دو“

کلا ”تو کچھ بولا؟“
 نوجوان ”ہاں مجھ سے عرضی لے لی۔ اور بولا۔ تمہارا ضرور خیال رکھیں گے۔
 میں شکریہ کہہ کر چلا آیا۔ دیکھو اسمگلر آبلہ پڑ گیا ہے۔ آسمنہ دانا۔ آف..... ہاں

تم اپنی بتاؤ۔ دن بھر کسی طبیعت رہی“
 (کملا خاموش رہتی ہے)
 نوجوان ”کملا.....“

(وہ پھر خاموش رہتی ہے۔ یہ پھر
 قدے زور سے پکارتا ہے۔)
 ”کملا.....“

(وہ پھر خاموش ہے)
 ”کملا۔ تم بولتی کیوں نہیں۔ ذرا میری طرف دیکھو..... دیکھو.....
 یہ کیا؟ تمہارے آنسو۔ کیوں رونے کیوں ہو؟
 (وہ پھر خاموش ہے)
 ”کیا تمہیں یہ کام پسند نہیں۔ یہ تو بہت اچھا کام ہے..... کیا
 تمہیں کوئی تکلیف ہے۔ بولو۔ بولو! تمہیں کیا دکھ ہے؟“
 کملا ”کچھ نہیں۔“

نوجوان ”کچھ تو ہے۔ بتاتی کیوں نہیں“
 کملا ”آپ نہیں سمجھ سکیں گے“
 نوجوان ”میں نہیں سمجھ سکوں گا۔ تو تمہاری بات اور کون سمجھیکا۔ تم بھول
 گئی ہو کیا۔ کہ میرے سینے میں پیار کرنے والا دل ہے۔“
 کملا۔ میری بات سمجھنے کے لئے ایک عورت کا دل درکار ہے۔ عورت
 بھی وہ جب کاخاوند بیکار ہو۔ اور ہر چہار طرف سے دوسری عورتوں کے طعنے

صاحبوں سے ملے۔ سب نے ہمارے حال سے ہمدردی ظاہر کی۔ بہت کیا۔ تو وعدہ بھی کر دیا۔ لیکن کس کس نے وعدہ پورا کیا؟ آپ نے ان صاحب لوگوں کے پیچھے پیچھے پھر کر غنی محنت کی۔ غنی ٹھوکریں کھائیں۔ غنی جھڑکیاں سہیں۔ اس سے بہت کم محنت کرتے ہوئے آپ گھر کا خرچ چلا سکتے تھے! البتہ مزدور بنکر پھر اس بابو پن کے ڈھونگ سے کیا فائدہ؟

نوجوان: ”یہ لوگ کیا کہیں گے.....“

کھلا: ”تو آپ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ یہ لوگ جو آپ کو اب ”بابو“ کہتے ہیں۔ سچے دل سے کہتے ہیں۔ یقین جانیئے۔ کہ وہ لوگ آپ کو بابو کہتے ہیں۔ لیکن بابو کی طرح عزت نہیں کرتے۔ مزدور سے بھی بُرا سمجھتے ہیں۔ اور پھر ہم انکے پاس روپے ہی کیوں۔ مجھے مزدوروں کے ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں رہنا منظور ہے اب کے پڑھے لکھے ہونے کی غنی قدر وہ لوگ کریں گے۔ یہاں کے بابو لوگ نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ آپکو ”بابو“ کہتے ہوئے منہ لہراتے ہیں۔ وہ لوگ بھی آپ کو بابو کہیں گے۔ لیکن سچے دل سے۔ یہاں سے آپ کی ہزار گنا زیادہ عزت کریں گے۔ آپ سوچیئے کہ ان ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں رہ کر..... چار آنے روز کی مزدوری کر لینے سے دل کو جو سکون حاصل ہو سکیگا۔ وہ یہاں ہزاروں روپے کا کبھی نہیں حاصل ہوگا۔ چلو ناقد! ان پڑھے آدمیوں کی دنیا چھوڑ کر غریب بن جائیں۔ کوئی مزدوری۔ دستکاری کریں۔ کوئی آزاد کام کریں۔ نہ تو کوئی ملنی ہے اور نہ ہم نوکری کریں!“

(تدریس خاموشی)

مسافر یہ نہیں محنت مزدوری کرنا کس نے سکھایا۔ یقیناً اس نے تمہیں
سیدھے راستے پر ڈال دیا ہے۔
(پھر خاموشی۔ تانگے موٹروں کی آوازیں)

مسافر: "نوجوان"

نوجوان: "جی"

مسافر: "ٹھہرو۔ یہ سلمان اتار دو"

نوجوان: "یہ تو سڑک ہے بابو جی"

مسافر: "ہاں سڑک ہے۔ آگے چلنے سے پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تمہاری آنکھوں
میں آنسو کیوں آئے"

نوجوان: "نہیں تو بابو جی"

مسافر: "چھپاؤ نہیں نوجوان۔ میں نے تمہیں دو تین مرتبہ آستین سے آنسو
پونچھتے دیکھا ہے۔ مجھے سچ سچ بتاؤ۔ تمہیں کیا تکلیف ہے"

نوجوان: "کچھ نہیں بابو جی چلیے"

مسافر: "نہیں نوجوان۔ میں آگے نہیں جاؤنگا۔ پہلے یہ بتاؤ تم مزدور نہیں
معلوم ہوتے۔ تمہیں ایسا کرنے کو کس نے کہا ہے۔ کیا اس سے تمہیں تکلیف
ہو رہی ہے"

نوجوان: "نہیں۔ میری بیوی....."

(اس کے آگے آواز بھٹا جاتی ہے)

مسافر: "تم تو خوش قسمت ہو۔ جو اتنی غفلت نہ ہو رہے ہو۔ پھر اس پر"

دکھ کی کوئی بات ہے..... اسے پھر تھپائے آنسو نکل آئے۔ بتاؤ نوجوان
تہیں کیا دکھ ہے؟

نوجوان : وہ سخت بیمار ہے !

مسافر : بہت سخت ؟

نوجوان : صبح بیہوش چھوڑ آیا تھا !

مسافر : تو کیا ڈر ہے۔ چلو ہم پہلے اسکو دیکھتے ہیں !

نوجوان : نہیں بابو جی۔ مہربانی !

مسافر : گھبراؤ نہیں۔ میں ڈاکٹر ہوں !

نوجوان : لیکن میں کچھ مزدوری کماؤں بغیر گھر نہیں جاؤں گا ! چند سکول کی

چھینٹا ہٹ، مسافر جلسہ چلو۔ ایک تا نگہ بلاؤ !

تفسیر منظر

(نوجوان کا مکان۔ کمرہ بیہوش پڑی ہے۔ نوجوان اور ڈاکٹر کی آمد)

نوجوان : کمرہ۔ کمرہ میں آگیا..... اٹھو کل (اوپر نچی آواز سے) اکل !

ڈاکٹر : اسے اچھی طرح سمجھو ! نوجوان !

نوجوان : کمل۔ میں آگیا !

کمرہ ہوں.....

نوجوان : کمرہ !

کمرہ (دھڑک) میں آگیا ! آگئے ! مزدوری نہیں ملے گی کیا ؟

نوجوان "کمل - کمل - ویکھو یہ غلط ہے - دراصل میں کچھ کما کر نہیں لایا -
 ان بابو صاحب نے ترس کھا کر دے دیا ہے - مجھے تو مزدوری بھی نہ مل سکی -"
 کمل "کیا کیا کہا - مزدوری بھی نہیں ملی - اور ترس کھا کر بیٹے (اے کھچتی
 ہے) جھکوان! ابھی تک بہکار - بھر - گ - وا - ان -"

نوجوان "کمل! ڈاکٹر.....!"

ڈاکٹر "بد قسمت نوجوان!"

نوجوان "یہ کیا ہو گیا - ڈاکٹر!"

(ڈاکٹر - کچھ جواب نہیں دینا - منہ پھیر کر آنسو پونچھ لیتا ہے)

لاہور - فروری ۱۹۴۰ء

بڑا بھائی

ایک خاموشی پسند ساتی کی مانند سنسان مگر چاندنی رات نے ایک عالم کو چاندنی کی شراب پہنلا دیا تھا۔ کائنات کا ہر ذرہ خاموش تھا۔ گویا بھی آغازِ شب تھا لیکن چاندنی میں لپٹی ہوئی لیلۂ شب کے تیور کچھ ایسے مدہوش کن تھے کہ کوئی بھی ہوش میں نہ رہ سکا۔ سب بیہوشی کی نیند سو گئے۔

گرمی کا موسم شہر کے اس حصہ میں جسے غریبوں کی بستی کہتے ہیں تمام گلی کوچے چارپائیوں سے پے پڑے ہیں۔ پرائی طرز کے ایک دو لمپوں کی مدھم بونستی میں ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکا آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ لباس بوسیدہ، چہرہ بے رونق۔ لیکن چال ڈھال قد سے شاعرانہ، وہ ایک جھونپڑی نامکان کے سامنے ٹھہر گیا۔ ایک چارپائی خالی پڑی تھی۔ ساتھ والی چارپائی پر وہ پیچے سوہے تھے۔

سالہ نشی اور دس سال کا ملازمی مودو نزل کو بیٹھی نیند کی گود میں دیکھ کر اسکے بے سوتلے چہرے پر مسکراہٹ کا ایک خطا بھرا اور مٹ گیا۔ گویا ایک اکیلا ستارہ چمکا اور اسکی روشنی آسمان کی مہیب وسعتوں میں کھو گئی۔

رٹ کا آہستہ سے چارپائی پر دراز ہو گیا۔ اسکی نگاہیں آسمان کے ستاروں میں اٹک گئیں۔ کیا جانے وہ کیا دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔ جلدی سے آنکھیں پونچھ لیں اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اسکے آنسو کسی نے نہیں دیکھے۔ وہ پھر لیٹ گیا۔ لیکن وہ سونہ سکا۔ جب جب وہ آنکھیں بند کرتا تو اسکی بھوکی آستیں پیٹنے میں لگتا۔ اس نے دونوں کے بھوکے پیٹ کو بہتیرا بچھانے کی کوشش کی۔ مگر جب چھوٹے بھائی اور بہن نے کہا کیا تو سمجھ میں نے ہی کھایا۔ لیکن پیٹ کا دل تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ ہمدوم ہری شنکر کے جذبات محسوس کرتا۔ بھوکا پیٹ برابر جھٹا چلاتا رہا۔ بالآخر وہ مجبور ہو کر آہستہ سے دروازہ کھول کر مکان میں داخل ہو گیا۔ اندھیرے میں اس نے ہنڈیا ٹٹولی وہ بالکل خالی تھی۔ ہری شنکر کا دل بیٹھ گیا۔ اس نے پیٹ کو ہاتھ سے دبا لیا۔ لیکن بھوکا شیر کب مانتا ہے۔ ہری شنکر کے لئے اب ایک ہی چارہ تھا کہ وہ زور سے چلائے جب انسان کا کوئی غمخوار نہ ہو تو ایسے موقع پر اسکو تسکین دینے کے لئے قدرت نے کئی بے بہا موتیوں کو آنسو بن کر ٹپکنے کے لئے وقف کر رکھا ہے۔

وہ رعبا بھی چاہتا تھا کہ کئی سال پیشتر کا ایک واقعہ اسکی آنکھوں میں پھر گیا۔ جب موت نے اسکی بیوہ ماں کا دامن نکالا ہوا تھا اور وہ ٹوٹی ہوئی آواز

میں دس گیارہ سالہ ہری شنکر کو سمجھا رہی تھی کہ ”یہ چھوٹی بہن اور بھائی انتہا سے
 اُتھرے ہیں۔ دیکھنا بیٹا۔ اب انکی ماں نہ ہوگی جو اُنکے چاؤ چو پھلے دیکھے باب ان
 کیساتھ ماں کا لاڈ اور باپ کا پیار تمہیں کو کرنا ہے۔ دیکھنا ماں باپ کی کئی محسوس
 کر کے یہ ننھے پونے کہیں مرجھانے جائیں۔ اور اگر تم نے ان سے منہ موڑ لیا تو پھر
 تمہاری ماں نہ ہوگی جو تمہارے لئے اور بھائی جن سکے۔ بیٹا! دنیا میں سب کچھ مل
 سکتا ہے۔ لیکن ماں کا پرٹ نہیں ملتا۔ یہ بھی جانتی ہوں، تم خود ابھی ننھے ہو اور
 تمہیں کس کے حوالے.....“ یہاں اگر ماں پھوٹ پڑی تھی۔ آخر میں اُس نے
 جاتے جاتے محض اتنا کہا تھا ”بھگوان تمہیں بڑھوں غنتی عقل دے“ ماں کی دعا
 خالی نہ گئی۔ اسکے ان الفاظ نے ہری شنکر کی جوانی چھین لی۔ وہ بچپن سے سیدھا
 بڑھاپے میں داخل ہو گیا۔ اس میں شباب کی شوخیاں ظاہر ہی نہ ہوئیں۔ اس
 کسی ہی میں بچپن کی شوخی یا جوانی کے ایسے پن کی بجائے اس میں بزرگوں کی
 سی مناسبت اور سنجیدگی آگئی تھی اسے اپنے ”بڑا بھائی“ ہونے کا بہت احساس
 تھا۔ ماں کی خواہش اس کی لوح دل پر کندہ ہو چکی تھیں۔ اور اُسے جزلانا ہی
 اس نے اپنا ایمان بنا رکھا تھا۔ اس نے اپنی تمام خواہشات اپنے تمام جذبات
 اور دلوں کو چھوٹے بھائی اور بہن کے چاؤ چو پنچلوں پر بچھا ور کر دیا۔ ان کو
 پہلے کھلاتا۔ خود بعد میں کھاتا۔ چنانچہ آج دو روز سے وہ اسی لئے بہت رات
 گئی گھروٹا تھا کہ گھر میں محض دو بچوں ہی کے کھانے کے لئے کافی خوراک تھی۔
 چنانچہ جب وہ انتظار سے ٹھک کر خود کھانا کھا کر سو رہے تھے تب یہ گھر آتا، تاکہ
 انہیں معلوم نہ ہو کہ بڑے بھائی نے کھانا نہیں کھایا۔ لیکن آج اسکی قوت

برداشت جواب دے گئی تھی، وہ چلانا چاہتا تھا۔ کہ ماں کے آخری الفاظ اسکے کانوں میں اس زور سے گونجنے کہ کلیلاتے پیٹ کی جھنج و پکار ان میں گم ہو گئی۔ جو دل ہاتھوں سے نکلا پڑتا تھا۔ اس نے پھر ٹھہرا س باز دھی۔ اس نے پانی کا ایک گلاس بھر کر پی لیا۔ پھر دوسرا اور تیسرا بھی۔ اور پھر چار پانی پر لیٹ گیا۔

وفعتہ کسی خیال سے چونک کر وہ پھراٹھ بیٹھا، جیب میں ہاتھ ڈاکر ایک روپیہ نکالا، یہ اس کا آخری اثاثہ تھا۔ ماں مرتے وقت چاندی کے دو چار نوچھوڑ گئی تھی جو ایک ایک کر کے تمام بک چکے تھے، ایک آخری نوچ جو بیچ گیا تھا۔ ہری شنکر آج اُسے بھی بیچ آیا تھا۔ دوسرے روز دسہرے کا تیور تھا اور وہ یہ برداشت نہ کر سکتا تھا کہ بڑے بھائی کے ہوتے ہوئے مراری اور نشنی دوسرے بچوں کو مٹھائی کھانے اور کھلونے لاتے دیکھ کر دل مسوس یں۔ اسکے سامنے محض ایک مقصد تھا کہ ان دونوں کو کسی طرح ماں کی کمی محسوس نہ ہو۔ اُسے آئندہ کی فکر نہ تھی۔ اس وقت اُسے یہ خیال نہ آیا کہ یہ روپیہ ختم ہو جانے کے بعد..... کیا کھا پیئے۔ اُسے اپنا فرض پورا کرنا تھا۔ اور یہ سمجھتا تھا کہ ان بچوں کو روٹی مہیا کرنا کسی بالائی طاقت کا فرض ہے۔

ہوا بھی ایسا ہی، انہی دنوں ہری شنکر کو کسی رئیس کے ہاں ملازمت مل گئی۔ اسکے چہار سالہ بچے کو کھلانے کی۔ اب اسکی قد سے آرام سے کٹنے لگی جننی کہ نہ جانے کس کونے سے نشنی کی جوانی عود کر آئی، نشنی کی آنکھوں میں مصیبت کی جگلاب جیانے لے لی، وہ اب گھر سے باہر نہ نکلتی، ایک روز ایک امیر زائے نے ہری شنکر کو

راہ چلتے بلایا اور کہتے لگا۔ "فیشی کو صبح ہمارے گھر بھیج دینا! کچھ تعجب اور گھبراہٹ کے عالم میں ہری شنکر کے منہ سے نکل گیا "تمہارے گھر؟ کیوں؟"

امیر زادہ بولا۔ "ماں کہتی تھی کہ چونکہ برتن کر جایا کر گئی اسے بھائی تمہاری کچھ غلطی بہت مدد ہو جائے گی!"

جیسے کسی نے ہری شنکر کے دل پر گھونسا مارا، اُس نے امیر زادے کی آنکھوں میں ایک برق آگیں چمکا ڈی جھپکتی دیکھی اس چمکا ڈی نے اُسکے دل میں آگ پھونک دی۔ ایک لمحہ کے لئے وہ بھول گیا کہ وہ مفلس ہے اور کہ یہ بے عزتیاں اسے وراثت میں ملی ہیں۔ وہ سوچنے لگا۔ کہ "فیشی" اور میرے ہوتے ہوئے لوگوں کے جھوٹے برتن صاف کسے؟

رہ نہ کہ اس امیر زادے کی آنکھوں کے نفسانی شرارے ہری شنکر کی رگوں میں آگ جھونک رہے تھے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ اس وقت ہری شنکر کے ہاتھوں کوئی اثر تھو کیوں نہ ہوا، البتہ وہ کسی طرح موقع ٹال کر چلا گیا۔ کاش۔ یہ امیر لوگ کسی غریب بڑے بھائی کے سینے میں ہاتھ ڈال کر اسکے دل کو ٹٹول سکتے، اس واقعہ کے بعد ایک نئے غم نے ہری شنکر کا دامن تھام لیا۔ اب وہ طالت دن فیشی کی مشادی کی فکر میں رہنے لگا۔

مراری بھی اب کام کرنے کے لائق تو ہو گیا تھا، لیکن وہ کتنا دھرتا کچھ نہ تھا بلکہ یوں کہو، کہ بڑے بھائی کی لانا تھا محبت نے اس کو بگاڑ دیا۔ عادات و خصائل میں وہ اپنے بھائی کی ضد تھا، اُسے بُری صحبت ملے تھی۔ کئی مرتبہ بستی کے لوگوں نے بلکہ خود فیشی نے بھی مراری کی شرارتوں اور زیادتیوں کی شکایت کی

مگر ہر مرتبہ ہری شنکر لوگوں کو یہی کہتا: ”بھٹی میں سمجھا دوں گا“ لیکن جب مراری اس کے سامنے ہوتا، تو نہ جانے دل کے کس کس کو نے سے محبت و شفقت کا ایک چشمہ پھوٹ پڑتا۔ جو اپنی رو میں تمام شکوے شکائت بہا لے جاتا ہری شنکر کا گلاب بند ہو جانا اور وہ محض اتنا کر سکتا کہ چھوٹے بھائی کو اپنی آغوش میں بھینچ لے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کی اس میں سکت ہی باقی نہ رہتی ایسے موقعوں پر کئی مرتبہ ہری شنکر کی آنکھوں میں ایک آدھ آنسو بھی چمک اٹھتا۔ ان باتوں سے مراری اور بگڑتا گیا۔

ایک روز ہری شنکر خوش خوش گھر لوٹا۔ وہ تمام دن نشی اور مراری کو ایک خوشخبری سنانے کے لئے بے تاب رہا تھا۔ چھٹی ملتے ہی وہ بھاگ بھاگ گھر آیا۔ وہ تمام راہ نشی کی شادی کا تصور باندھتا آیا۔ آج اُس نے نشی کی شادی طے کر دی تھی، انہیں مسرت انگیز خیالات میں غلطیوں میں جب وہ گھر پہنچا تو اُس نے نشی کو چشم براہ پایا۔ وہ دروازے کی آڑ میں سے اسی کی راہ تک رہی تھی۔ اندر آتے ہی اُس نے اس کا دامن تمام لیا۔ اس کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو تھے، جو محض ہری شنکر کی آمد کے منتظر تھے۔ اسکے آتے ہی وہ بھی نشی کے دل کی مانند قرار کھو کر پھوٹ پڑے۔ ہری شنکر نے فرط استعجاب میں پوچھا: ”نشی کیوں؟“ نشی نے کہا: ”مراری.....“ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی، البتہ کلمہ پورا کرنے کے لئے آنسو آنکھوں سے نکل آئے، ہری شنکر نے مضطرب ہو کر پوچھا: ”کہاں سے مراری.....“

نشی نے اندر کی طرف اشارہ کیا، وہ بجلی کی مانند اندر آ گیا مراری اوندھے منہ

پڑا تھا۔ اس کے قریب پہنچتے ہی ہری شنکر کو سارا معاملہ سوچھ گیا۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ مراری آج شراب پی آیا تھا۔ یہ اسکی بڑی صعبت کا حاصل تھا ہری شنکر کا چہرہ ایک بار لگی تمنا اٹھا۔ اُس نے کہا: ”اسی طرح پڑا رہنے دے اسے پانی تک نہ پوچھ“ لیکن سجانے کیوں وہ خود اس پر عمل نہ کر سکا۔ کبھی وہ بھائی کا سر سہلانا اور کبھی تلوے، اسی طرح اس نے تمام رات آنکھوں ہی میں کاٹ دی۔

اس واقعہ کے بعد مراری اور کھل کھلا، یہ واقعہ اسی قسم کے مسلسل واقعات کا آغاز ثابت ہوا۔ حتیٰ کہ مراری کا شراب پینا مستم ہو گیا۔ بھائی کی تمام کوششوں کا نتیجہ اگر کچھ ہوا تو یہ کہ مراری نے شراب کے ساتھ ساتھ جو ابھی شروع کر دیا۔ اور جوئے کا لازمہ عیاری بھی اس میں آموجود ہوئی، ہری شنکر ان باتوں کو کچھ تو خون کے گھونٹ پینا۔ اُس نے مراری کو سدھارنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ریت میں پانی نے اثر کرنا تھا نہ کیا۔

ہری شنکر نے کسی نہ کسی طرح نشنی کا بوجھ اتارنے کا بندوبست کیا۔ سسرال جاتے وقت نشنی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر بھائی سے کہا: ”بھیا، مراری کا کیا بنے گا؟ ہری شنکر نے اسکی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا:۔

”اس کا کیوں فکر کرتی ہو؟ نشن۔ وہ سدھری جا بیگا اور پھر اس کا بڑا بھائی جو موجود ہے، جب تک میں ہوں، تم دونوں کیوں فکر کرو؟“ ہری شنکر کے سر پر جو سب بھاری بوجھ تھا۔ نشنی کے سسرال جانے پر وہ ہلکا ہو گیا۔ اب

گئیں مراری کی اوباشیاں اور ہری شنکر کی اپنی ذات ۔

ایک غمروسی امر کا ذکر تو رہا ہی جاتا ہے ۔ یہ صبح سے کہ زمانہ کی ستم ظریفوں نے ہری شنکر کی شوخی چھین کر اُسے سنجیدہ مٹین بنا دیا تھا ۔ لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔ کہ وہ نوجوان تھا ۔ اور ایک شاعرانہ دل رکھتا تھا ۔ اور ایک نوجوان دل پر جو گنہگار کرتی ہے وہ اس پر بھی بیت چکی تھی ماس کا دل بھی کسی کی زلفوں کے پیچ میں کھو گیا تھا ۔ وہ بھی کسی کے رخ پر نثار ہو چکا تھا ۔ علیحدہ بات ہے ۔ کہ واقعات کے اُلٹ پھیرنے اس کے عشق میں سرگرمی نہ پیدا ہونے دی ۔ اور نہ ابھی تک اس کی بوہی پھیلنے پائی ۔ لیکن اس ظاہری بے رنگی نے اندرونی طور پر اس کی محبت کو اس قدر گہرے رنگ سے رنگ دیا تھا کہ کئی سبیل حوادث بھی اُسے نہ دھو سکیں ۔ وہ دن کے وقت دکھائی دینے والے آسمان کی مانند تھا ۔ جس کے سینے میں سینکڑوں ارمانوں کے داغ ستاروں کی شکل میں موجود ہوتے ہیں ۔ لیکن بظاہر نظر نہیں آتے ۔ اس کی اتھاہ محبت پر سنجیدگی کچھ اس طرح پردہ کئے ہوئے تھی ، جس طرح کسی گہرے سمندر کی خاموش سطح ۔ جس کے پردے میں ہزاروں لہریں تیناؤں کی مانند اٹھ رہی ہوتی ہیں ۔ جسکے دل میں کئی پر شور طوفان اٹھتے ہیں اور وہی ہیں بیٹھاتے لیکن سطح پر ایک لالہ دی سکون ظاہر ہوتا ہے ۔

غرضیکہ اُسے چمپا سے عشق تھا ۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ایک سنجیدہ شخص کا عشق کس قدر پختہ ہوتا ہے ۔ چمپا ایک غریب گھسیائے کی لڑکی ریشہ سے باہر ایک جھوٹے میں رہتی تھی ۔ جہاں ہری شنکر ہر روز اپنے ننھے مالک کو

گاڑی میں بٹھا کر ہوا خوری کے لئے لے جانا۔ اس نے چپا سے شادی کی ہوتی لیکن آج تک بڑے بھائی کا فرض چپا اور اسکی شادی میں مانع تھا۔ کیونکہ وہ محسوس کرنا تھا، کہ بھتی کی شادی کا مقدس فرض پورا کئے بغیر وہ شادی کا حق نہیں رکھتا۔ لیکن اب اس نے چپا کے ساتھ اپنے دامن کی گرہ باندھنے کی بات طے کر لی۔ اسکے لئے کسی خاص تیاری کی ضرورت نہ تھی، دونوں کے پاس محبت کی دولت کے سوا کچھ نہ تھا۔

جوں جوں مقررہ روز نزدیک تر ہوتا گیا۔ ہری شنکر کے تصور کے سامنے نئی نئی دنیا میں آباد ہوتی گئیں۔ کئی مرتبہ وہ آئینہ زندگی کے تجیل میں کھو جاتا، چمپا کا خیال ایک نشہ تھا جو رفتہ رفتہ اس پر چھا گیا۔ لیکن واقعات کے ایک ہی پلچر نے اسکی شراب میں نمک گھول دیا۔

ایک روز اس نے مراری اور اسکے ادباش دوستوں کو باتیں کرتے سنا وہ لوگ اُسے بھڑکا رہے تھے اور ہری شنکر کے کانوں میں مراری کے یہ الفاظ پڑے۔ ہاں۔ بھائی کو میری کیا فکر اُسے تو اپنی شادی کی دھن سمار ہی ہے میری ماں ہوتی تو کوئی میرا بھی خیال رکھتا۔ یہ الفاظ سن لینے کے بعد ہری شنکر کی حالت بے حتم اس خرد من کی مانند تھی۔ جس پر ابھی ابھی بجلی گری ہو۔ وہ اس ہرنی کی مانند تڑپ اٹھا جس گئے بچے کو شکاری کے تیرنے موت کا پیغام سنا ہو۔ اس روز وہ ماں کی تصویر کے سامنے دل کھول کر بویا اس نے ہلک ہلک کر ماں سے کہا تم تباہ ماں! میں نے کس دن مراری کا خیال دل سے بھلایا، کس دن اس کو کھلانے سے پہلے خود کھایا۔ کیا میں نے اسکو ذرہ بھر

تکلیف سے بچانے کے لئے اپنے سر پر پہاڑ نہ اٹھائے؟ کیا میں نے اس کے تمام تازہ برواشت نہ کئے؟ کیا میں نے اس کے دل کو کوئی تھیس پہنچنے دی؟ کیا میں نے وہ کچھ نہ کیا جو شاید تم بھی نہ کر سکتیں۔ تب تب کیوں اس نے ایسا کیا..... ماں.....! تم نے مجھے بڑا بھائی کیوں بنایا؟ ماں کی تصویر نے سچائے ہری شنکر سے کیا کہا البتہ کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ہری شنکر کی شادی یک لخت کیوں رُک گئی، اب ہری شنکر کے سینے میں اراٹوں کی ایک خاموشی آگ دی ہوئی تھی۔

اب ہری شنکر ماری کے لئے کسی لڑکی تلاش میں تھا۔ انھا دونوں ایک اور واقعہ ایسا ہوا جس نے بساط ہی الٹ دی۔ اس نے سنا کہ ماری اب کہتا ہے کہ وہ اسی لڑکی سے شادی کرے گا۔ جو ہری شنکر نے اپنے لئے تلاش کی ہے۔ ہری شنکر کی برواشت کی حد ہو گئی۔ اس کا رشتہ صبر اس قدر تن گیا کہ اب اس میں لچک کی مطلق گنجائش نہ رہی۔ اس نے ماری کو بھایا۔ لیکن جہاں تک سمجھ بوجھ کا باد چلتا ہے، ماری تو ان حد کو پار کر چکا تھا۔

ہری شنکر نے بھائی کے پاؤں کپڑے اور آنکھوں میں آنسو بہا کر ایک عاجز گداگر کی مانند بیک مانگی۔ ماری میرا سب کچھ تنہا رہے۔ تم مجھ سے میری جان لے لو۔ لیکن یہ مطالبہ نہ کرو۔ ماری یہ نہ جان سکا کہ بھائی نے اس ایک فقرہ میں اپنی محبت براہ راست رشتہ اور سب سے بڑھ کر اپنی زندگی کا واسطہ دیا ہے، آخر وہ سمجھتا بھی کیوں ہو۔ قدرت نے اسے بڑا بھائی

نہ بنایا تھا۔ اس نے ناپا بیدار نفس کی خاطر اس شے کو روک دیا جس کا پہلہ
بہشت کی رحمتوں پر بھی بھاری ہے، اس نے بڑے عیب کی محبت
ٹھکرا دی۔

مرامی کا رویہ دیکھ کر ہری شنکر نے خیال کیا شاید سخت الفاظ سے کام
نہل آئے، چنانچہ وہ اُسے ڈانٹ ڈپٹ کر کسی کام کو چلا گیا۔ واپس لوٹا تو ایک
چھوٹے سے لڑکے نے اُسے بتایا کہ آج مراری بھیا نے بہت شراب پی ہے اور
ایک چاقو لے کر یہ کہتا ہوا کہیں چلا گیا ہے کہ اگر وہ مجھے نہیں دیتا تو میں اس کے
لٹے بھی نہ چھوڑوں گا۔

ہری شنکر کا ماتھا ٹھنکا۔ اُس نے سوچا کہ نشے میں بد مست مراری
سے کچھ بھی بعید نہیں۔ اُس میں کھڑا رہنے کی سکت نہ رہی تھی۔ لیکن اس
کے باوجود وہ نہ جانے کس طرح ہوا کے پر لگا کر بھاگا۔ راہ میں وہ دل کو ٹھاکا
بندھاتا گیا کہ ”مراری کچھ بھی ہو۔ آخر میرا بھائی ہے وہ اتنا کبھی نہیں کر سکتا“
چمپا کے جھونپڑے کے قریب پہنچ کر اس کے پاؤں من من کے ہو گئے۔
اس کا دل طوفان زدہ کشتی کی مانند جھکے کھانے لگا۔ وہ جھونپڑے میں
داخل ہی ہونے لگا تھا کہ مراری باہر نکلا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں ٹھٹک
گئے۔ مراری کی نیچی نکا ہوں سے ہری شنکر سمجھ گیا کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔
وہ کھڑا نہ سکا۔ ندی کے طوفان زدہ کنارے کی مانند وہ وہیں بیٹھ گیا۔
اس وقت اس کے دل پر جو بیت رہی تھی اس کو بیان کرنے کا نہ قلم کو بار
ہے اور نہ اس کا صحیح اندازہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ سمجھ لیجئے، کہ ایک ایسا شکا تھا

جس کے سینے کو کئی شکاریوں کے چھوڑے ہوئے تیروں نے ایک ساتھ اگشتی کیا ہو۔ اور اس پرستم پر کہ اسکی جان ابگ گئی ہو۔ اوھر ماری کی یہ حالت تھی کہ قتل جیسا خوفناک جرم کرنے کے بعد اس کا تمام نشہ مہرن ہو چکا تھا۔ یہ فطرت کا تقاضا تھا کہ اسوقت اس کے دل میں وہ خفہ جذبات سر اٹھا رہے تھے جن کو بیدار کرنے کے لئے بڑے بھائی نے اپنی تمام طاقت صرف کر دی تھی۔ لیکن یہ اسوقت ہوا۔ جب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ بہری شنکر نے محض اتنا کیا کہ ماری کو مال کی تصویر کے سامنے لے گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس چوٹ نے بہری شنکر کے جذبہ احساس کو سن کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ تھے۔ نہ لب پر آہ، بہری شنکر نے ماں سے صرف اتنا کہا۔ تم نے دیکھا مال۔ ماری نے کیا کیا اب پرمانت مجھ سے سنبھالی نہیں جاتی۔ اسے تمہیں واپس سوپنا ہوں مجھے بڑے بھائی کے فرائض سے سبکدوش کر دو۔ ان وہ مختصر فقروں نے ماری کی آنکھوں کے سامنے بھائی کی محبت کا وہ باب کھول دیا جس کا خاتمہ نہ تھا۔ اس کے دل نے اس پر پھٹکار ڈالی۔ اس نے چاہا کہ ایک بار پھر بہری شنکر اسی طرح محبت بھرے الفاظ میں اسے سمجھائے لیکن وقت بیت چکا تھا۔

بہری شنکر نے عدالت میں خود خونی ہونے کا اقرار کیا۔ ماری کا منہ میرے برداشت نہ کر سکا۔ اس نے بھی عدالت کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ بہری شنکر نہیں۔ وہ خونی ہے۔ عدالت عجب محضے میں پھنس گئی۔ گیارہواں ماری نے

بن چکا تھا۔ وہ مجمعِ راستے پر آچکا تھا۔ فیصلہ سنانے میں کئی روز لگ گئے۔ عدالت کو شش کرنے پر بھی کوئی فیصلہ نہ کر پائی۔ دونوں بھائی کسی خوفناک گہرائی والے سمندر کی مانند سنجیدہ تھے، دونوں کے دلوں میں کیا جانے کیا کیا بدو جزیرہ ہوا تھا۔ ایک روز موقع ملا تو ہری شنکر کھلا۔ اس نے چھوٹے بھائی سے کہا: "مراری! آخر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ مجھے تباہ کیوں نہیں ہونے دیتے؟" مراری برداشت نہ کر سکا۔ وہ بھائی کے قدموں میں گر گیا اور روتے ہوئے کہنے لگا: "میرا گناہ بخش دو بھیا!" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ بھائی کے ہنسنے نہ امنت دیکھ کر بڑے بھائی کا ضبطہ بھی ٹوٹ گیا۔ وہ ایک کُتے ہوئے نالے کی مانند نکلا۔ روتے روتے اس نے بھائی کو اٹھا کھٹکے سے لگا لیا۔ اسے جی بھر کے پیار کیا اور بولا: "شباباش! تم سے ایسی ہی امید تھی۔ کیا آج بھی تم بڑے بھائی" کی ایک درخواست قبول نہ کرو گے؟" مراری بولا: "وہ سب نہیں۔ بھائی! تم حکم کرو۔ تمہارا ہر لفظ میرے لئے قانون ہے۔" ہری شنکر نے آہستگی سے جواب دیا: "تو مجھے مرجلنے دو؟" مراری کا دم تک رک گیا۔ بڑا بھائی کہتا گیا: "مراری! آج پہلی مرتبہ بڑے بھائی" کی درخواست منظور کرو۔ اب مجھے اور زیادہ تکلیف نہ دو۔ موجِ خوں میرے سر سے گزر چکی ہے اب مجھ میں زندگی کا بوجھ برداشت کرنے کی سکت باقی نہیں۔ میرے چپو توڑ دینے کے بعد اب میری کشتیِ محبات کو طوفان میں نہ دھکیلو۔ اسکے ڈوب جانے ہی میں راحت ہے۔ میں تم سے زندگی بھر کی محبت کے صلے میں صرف موت کی بھیک مانگتا ہوں۔" مراری جانتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں اپنے جھوٹے کونگ لگا رہا ہے۔ اپنے

ہی تیرے اپنا سینہ چھید رہا ہے۔ لیکن آج وہ اس مرحلے پر پہنچ چکا تھا کہ جہاں
 بڑے بھائی کے حکم سے نافرمانی کرنے کی مطلقاً گنجائش نہ رہ گئی تھی۔ اس نے
 اپنی عمر میں پہلی مرتبہ بڑے بھائی کی خواہش پوری کر کے اسکی زندگی بھر سچی
 محبت کا سلسلہ چکا دیا اور یہی ایک خیال کہ اس کا چھوٹا بھائی آخر کار فرمانبردار
 نکلا۔ پچاسی کے تحتے پر بھی بڑے بھائی کو تسلی دے رہا تھا۔

لاہور۔ مارچ ۱۹۴۰ء

(یہ افسانہ آل انڈیا ریڈیو سے براڈ کاسٹ کیا جا چکا ہے)

چھوٹا بھائی

کل نے الماری سے ایک کتاب نکالی لیکن یہ دیکھے بغیر کہ وہ کون سی
اُسے عقادت کے ساتھ پرے کونے میں پکے یا۔ اس طرح ایک ایک کر کے فرش کے اُ
سرے سے اس سرے تک کتابوں کا ایک بے ترتیب ڈھیر جمع ہو گیا۔

کتابوں کی یہ بے ترتیبی — اور اسکے دل کی پریشانی —
ایکسائینٹ سے گویا اسے ایک گوندہ شانتی کا احساس ہونے لگا۔ وہ قریب پڑکھ
کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ انکی نگاہیں کھڑکی کے باہر پھیلی ہوئی چنار کی ٹہنیوں کو چیر کر
کھڑے صنوبر کی چوٹی پر لگ گئی تھیں۔ اُسی کے نیچے وہ بیٹھی تھی۔ شاید اُسی کے لو
کی انتظار میں — لیکن نہیں وہ تو اس وقت بڑے بھیا کیساتھ ہنس رہی
میں مشغول ہوگی۔ بڑے بھیا۔ آخر یہ اس طرح ہر وقت اُس پر تاجا

تسلط کیوں جمائے رکھتے ہیں ابھی کسم سے دو چار باتیں بھی نہ کی تھی کہ جناب نے ڈھول پیٹنے شروع کر دیئے۔ کمل۔۔۔۔۔ اوکمل کہاں چلا گیا۔ اور پھر۔۔۔۔۔ نہیں شرم نہیں آتی اکیلے میں جو ان لڑکیوں کی بات باتیں کرتے جا۔۔۔۔۔ جا کر پڑھ۔۔۔۔۔ گویا اس کے لئے کسم سے بات کرنا گناہ ہے۔ گناہ کبیرہ۔

تو پھر دیکھا۔ اُسے یہ اپدیش سنا کہ خود کیوں اُسی کسم کے پاس چلا گیا۔ اس کے لئے کسم سے ہنسی ٹھٹھا گناہ نہیں؟ کیا محض ایک سال پہلے دنیا میں داخل ہو جانے سے یہ وہ بات جو اسکے لئے گناہ کبیرہ ہے۔ بڑے بھائی کے لئے کارِ ثواب بن گئی ہے۔ ثوابِ عظیم۔۔۔۔۔! محض ایک سال کے بہرِ بھیر سے کس قدر الٹ پھیر ہو سکتا ہے۔ سچی تو ہے۔ اُس روز گنیش گھاٹ والے راج جو نشی بھی تو ہی کہتے تھے۔ کہ ایک پل کے بہرِ بھیر سے وہی ستارہ بلائے عظیم ثابت ہو سکتا ہے اور وہی ایک سعادتِ عظمیٰ۔۔۔۔۔ اور یہاں تو ایک سال کا فرق ہے۔ ایک سال۔۔۔۔۔ ایک سال تھوڑا ہوتا ہے؟ اس میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہی دیکھئے نہ، ایک سال پہلے اگر دیکھا کہ مارنے ہر اچھی چیز اپنے لئے ریزوز کر لائی ہے۔ دولوں کے حالات میں کس قدر فرق ہے اس کے لئے تمام دن کمرہ میں بند رہ کر کتابوں کا کٹر بننا لازمی ہے۔ اور بڑے بھائی کیلئے پڑھانی اتنی ہی غیر ضروری ہے۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ ہر کام کی طرح امتحان کے کمرہ میں بھی وہ ہانک لگائیں گے۔ اہتمام کمل۔ ذرا یہ سوال تو حل کر جانا۔ ارے وہاں کیا کر رہا ہے۔ کجخت ابھی تک اپنا پرچہ بھی حل نہیں کر سکا۔ اسی لئے سارا سال کہتا رہا ہوں کہ پڑھ۔ پڑھ۔۔۔۔۔

لیکن امتحان کے کمرہ میں انہیں یہ سب کچھ کہنے ہی کون ویگا وہاں گھر ٹوڑا ہے۔ کہ بات بات پر کمال کو طلب کیا جاسکے۔ آخر یہ بڑے بھائی اتنے ظالم کیوں ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ سرویوں میں کئی بار وہ سخت حاجت کے باوجود اپنی گرم کی ہوئی نشست کو چھوڑ کر پیشاب تک کرنے نہیں جاتا۔ لیکن بڑے بھائی کی انکی آواز پر اگر کوئی نوکر حاضر نہیں ہوا۔ تو دیتے ہیں کمال کو آواز۔

”جانا کمال۔ ذرا پانی تو لانا۔۔۔۔۔ آنا۔۔۔۔۔ میری الماری سے وہ کاپی تو نکال دو۔۔۔۔۔“ وغیرہ۔ اور اگر کمال رتی بھر آنا کافی کہے۔ تو کونسا جبر نام ہے جو اس کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا۔ کبھی ریڈیو پر کوئی اچھا سا گانا ہو۔ یا کوئی اور دلچسپ محفل ہو۔ اور کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے۔ تو انکی نگاہیں آخر چھوٹے بھائی کو ڈھونڈ لیتی ہیں۔

اور یہ سب کچھ محض ایک سال کے ہیر پھیر کے باعث۔ راج جو تیشی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ کہ ایک پل کے ہیر پھیر سے وہی ستارہ بلائے عظیم بن سکتا ہے اور وہی ایک سعادت عظمیٰ۔۔۔۔۔ ستارے۔ یہ ستارے بھی انسان کی زندگی کو کس طرح اٹھل پھل کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ خوبصورت۔۔۔۔۔ ظالم۔۔۔۔۔

ستارے۔ کسٹم بھی ایک ستارہ ہے۔۔۔۔۔ نہیں بلکہ وہ تو ایک چاند ہے۔۔۔۔۔ پوڈیم کا چاند۔ کیا اُس پر بھی دیو کا ر کے ستارہ کا سایہ پڑ جائے گا۔ کیا اُس پہلے سال میں دیو کا ر نے کسٹم کو بھی اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا؟

اس خیال ہی سے وہ سحر اٹھا۔ وہ جیسے بوکھلا سا گیا۔

”کیا ہر جگہ میرا چھٹپن مجھے اس کے ہاتھوں شکست دلائیگا۔۔۔۔۔ زندگی

کے ہر مرحلہ پر وہ اس طرح مجھ پر غالب رہے گا؟ گھر میں ————— کا بچ میں
 میری آئندہ زندگی میں اور کس قسم؟ کیا کس قسم کے معاملہ
 میں بھی وہ مجھے پیچھے چھوڑ جائیگا نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا —————
 میں اس کے بنام جاؤنگا.....“

اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو دبا لیا۔ جیسے وہ پھٹنے والا ہو۔ وہ
 اس خیال کو بھی برواشت نہیں کر سکتا تھا چر جائیکہ حقیقتاً ایسا ہو جائے۔
 اُس نے اپنے دل میں طے کر لیا۔ کہ وہ کس قسم سے اس باپ سے دو ٹوک جواب لے کر بچا
 ابھی ————— اسی وقت۔

کمل کجری ہوئی گناہوں کو روندتا ہوا باہر نکل آیا۔ لیکن کس قسم کب کی اپنے باپ کے
 ساتھ واپس اپنے گھر جا چکی تھی۔ کمل گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ حضوری باغ کی ٹکڑ پر پہنچا
 تو سامنے سے کلو اگو جو رو دھ کی مثل اٹھائے آ رہا تھا۔ غالباً انہی کے ہاں جا رہا تھا۔
 یہ بھی تو بڑا بھائی ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی کہیں سے ایک لڑکی لے آیا تھا۔ لیکن
 اُسے اس نے اپنے گھر لے لیا ہے۔ پورے روز ماں کو سارا قصہ سن رہا تھا۔ اجی وہ
 رامو ہے تو میرا اسی چھوٹا بھائی ————— لیکن ہے بڑا بد ماں۔ کہوئے تھا۔ کہ اس
 چھوٹے کو مجھ سے اس کے ہے۔ بھلا آپ ہی بتاؤ۔ وہ ذرا سی جان وہ اس کے سگ
 کیا جانے۔ میں نے میرے ماں باپ کی لوندیا جان کے گھر لے لیا تو سسرے نے
 جانے اُسے کیا پٹی پڑھا دی۔ پھر بکڑ بیٹھی۔ بس ایک ہی بار ڈنڈا بربسا رہا ہے اُس
 دن سے سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے کیا بتاؤں۔ بلا میں وہ سہیٹ لانا
 ہے۔ سمیٹنی مجھے پڑ جاتی ہیں۔“

اُس کی یہ یادِ کارنامہ بائیں جب بھی کمل کو یاد آجاتی ہیں۔ تو اُس کا خون کھول اٹھتا ہے۔ یہ بڑے بھائی۔۔۔ جن کی ہر بات بڑپن کی موٹی تر کے نیچے چھپ جاتی ہے۔ جو بڑپن کی آڑ میں اپنی ہر جائز و ناجائز خواہش کو پورا کر لیتے ہیں۔ اور پھر ستم یہ کہ اس کے لئے نہ صرف داؤد طلب کرتے ہیں۔ بلکہ ان حرکتوں کیلئے چھوٹوں سے شکریہ کے طالب بنتے ہیں۔“

کمل کو زور کا دھکا لگا۔ وہ ایک سائیکل سے ٹکرا گیا تھا۔ سائیکل سوار نہایت جُزْبُز ہوا۔ اونٹ جتنے بڑے ہو گئے ہو۔ اور ابھی تک سڑک پر چلنا نہیں آیا۔ کمل کے منہ سے حیرانگی کے مائے نکل گیا۔ بڑا۔۔۔؟ وہ جاتا جاتا جواب دے گیا۔ نہیں بڑے کا ہے کو۔۔۔ ابھی تو خیر سے چھوٹے نیچے ہو۔ ننھے منے۔ پھر سڑک پر گیا کرنے آئے ہو۔ جاؤ ماں کی گود میں بیٹھو۔۔۔“

وہ چلا گیا۔ کمل سوچتا ہی رہ گیا۔ گویا چھوٹوں کیلئے سڑک پر چلنا بھی ممنوع ہے۔ یقیناً یہ سائیکل والا بھی کسی کا بڑا بھائی ہو گا۔ ان بڑے بھائیوں نے آخر یہی سمجھ کیا رکھا ہے۔۔۔ نہیں جانتے کہ ہمیشہ سے چھوٹے بھائی ہی عظیم ہستیاں بنتے آئے ہیں۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے۔ لیکن بھرت پور لین۔ حضرت یوسفؑ۔ یہ تمام آخر چھوٹے بھائی ہی تو تھے۔“

سامنے ابر اکمل کے بازار میں ایک نوجوان کٹڑی کے ایک ڈبڈے پر نقلی سلک کی ٹکٹیاں لٹکائے بیچ رہا تھا۔ اس نے شاید دو سال ہوئے ہی اُسے پاس

کیا تھا۔ اس نے نکٹائیاں کل کے اُگے کر دیں۔ کل ٹٹھک گیا۔ اور اُسکے منہ کی جابا
 دیکھنے لگا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ البتہ ایسی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ گویا
 کہہ رہا ہو دو کس کس کے پیچھے جا رہے ہو کل بابو۔ ایک نئی نکٹائی خرید لو تمہاری
 نکٹائی پھٹ گئی ہے۔ تمہیں اس وقت کس سے زیادہ نئی نکٹائی کی ضرورت ہے
 پھر ایک کیا نئی کس تمہیں دستیاب ہو سکتی ہیں اُسے دیکھتے گیا ہو۔ خریدتے
 گیوں نہیں۔ میری پھٹی ہوئی نکٹائی دیکھ رہے ہو؟ میں جب کالج میں پڑھتا
 تھا۔ تو ہر روز نئی نکٹائی لگایا کرتا تھا۔ اب بھی مجھے کہیں کام کی مل جائے دو
 اگر آدھی تنخواہ ہر ماہ نکٹائیوں پر خرچ کر دوں تو کہنا تمہیں کم از کم ایک
 تو ضرور خرید لینی چاہیئے۔ بڑے بھائی سے ڈرتے ہو۔ یہ کس نہیں کہہ سکتے
 بھی قبضہ کر لے۔

کل چونکا۔ نکٹائی فروش اب تک بالکل خاموش کھڑا تھا۔ کل نے اُسے غور
 سے دیکھا۔ اُسکے دونوں مونے لب جیسے کسی انجان موجد نے سی دیئے تھے۔ جن
 میں کئی سلوٹیں رہ گئی تھیں۔ تو پھر یہ بات کس نے کہی تھی۔ کل سمجھ نہ سکا
 اور خاموشی سے سر ہٹکا کر پھر چلا پڑا۔ اس نے پل پار کیا۔ اس پار کا بازار بند
 ہو رہا تھا۔ پرتاپ باغ کے قریب کئی بدصورت مرد خوبصورت عورتوں کے
 ساتھ سیر کر رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ کتنے بے چارے ہیں جب کس کے
 ساتھ میری شادی ہو جائیگی۔ اور ہم بھی سیر کرنے نکلا کر چلے۔ تو کئی عورتیں ہمیں
 حسد سے دیکھا کریں گی۔ نہیں ہم اس طرف بھی سیر نہیں کیا کریں گے۔ سنا ہے
 عورتوں کی نظر بہت بُری ہوتی ہے۔ ہم شکرگ باغ کی طرف جا یا نہ چلے

وہاں بہت کم لوگ جاتے ہیں۔ وہاں میں اور کسٹم..... "قریبی جھاڑی میں سے اچانک کوئی زور کا تہقہہ مار کر مہنسا۔ وہاں چند کالجیٹ خوش گلیوں میں مصروف تھے۔ کمل کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے کسی چھوٹے بھائی کے ان خوابوں کو سنکر جو کبھی پورے نہیں ہو سکتے۔ کوئی بڑا بھائی ایک طنز پر قہقہہ لگائے۔

"ہاں ٹھیک ہی تو ہے۔ اس نے ٹھیک ہی قہقہہ لگایا ہے آخر مجھے کسٹم کے بارے میں یہ سب کچھ سوچنے کا حق ہی کیا ہے۔ وہ میری کون ہے۔ اور جو کچھ میں اسے پوچھنے جا رہا ہوں۔ یہ پوچھنے کا بھی مجھے کیا حق ہے۔ یہی کہ وہ مجھ سے ذرا ہنس بول لیتی ہے۔ میری ہر بات میں بہت دلچسپی لیتی ہے۔ یہ مرد لوگ بھی کس قدر خطرناک قوم ہوتے ہیں۔ ذرا کسی عورت ان سے دلچسپی کا اظہار کیا نہیں۔ اور بس وہ اس کے سر پر سوار ہونے کے درپے ہو جاتے ہیں....."

کمل یہ باتیں سوچتا رہا۔ رکنا نہیں اور کسٹم کے گھر پہنچ ہی گیا لیکن کسٹم کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ وہ نوکر سے اتنا سنگم باہر سے ہی پلٹ آیا۔

"ہاں وہ میری کون ہے۔ جو میرے آنے کا انتظار کرتی۔" اُسے اندر ہی اندر ایک بے چینی کا احساس ہونے لگا۔ اُسے کہیں تکلیف ہوئی تھی لیکن وہ ٹھیک ٹھیک تجزیہ نہیں کر سکا۔ کہ اُسے کس جگہ تکلیف ہو رہی ہے۔ سامنے کی دوکان پر ڈاکٹر چندریانی کا بورڈ آویزاں تھا۔ جس کے نیچے ڈگریوں کی جگہ انگریزی کے تمام حرف ابھی لکھے ہوئے تھے سوائے ایم۔ بی۔ بی۔

ایس یا ایل۔ ایس۔ ایم۔ ایف کے۔ کل دوکان کے اندر چلا گیا۔ ”کہیے۔ آپ کو کیا تکلیف ہے۔“

کل نے جواب دینے کے لئے منہ کھولا۔ لیکن کچھ کہہ نہ سکا وہ کیا بتاتا۔ کہ کہاں اور کیا تکلیف ہے۔ ڈاکٹر نے فوراً اٹھ کر کھلے منہ کے اندر کچھ دیکھا۔ اور کہنے لگا ”گلا یقیناً بہت خراب ہو رہا ہے۔ لیجئے۔“ تھروٹ پینٹ ”لگائے وینا ہوں۔ دیکھئے جینک لعاب بہتا رہے۔ تھوکتے رہیے۔“

”تھو کوں گا کہاں۔“

”اجی وہیں۔ اسی کونے میں تھوک لیجئے نا۔“ کل اسی کونے کی جانب منہ کر کے بیٹھ گیا۔ اس کے عین سامنے ڈاکٹر صاحب نے موٹے موٹے حروف میں لکھ کر کھانا تھا ”تھوکنے والو احوالہ پوچھ لیا جائیگا“ لیکن یہ تو ملاقاتیوں پر رعب ڈالنے کے لئے تھا۔ ورنہ مرلیضوں پر کوئی پابندی نہ تھی۔ یوں بھی اچھے ہاں مرلیض کبھی کبھار آتا تھا۔ وہ اسے ایسی معمولی بات کے لئے ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔

کل اسی کونے میں تھوکنے کے لئے بیٹھ گیا۔ اسکے دماغ میں مختلف فقعات گھومنے لگے۔ ”وہ سائیکل سوار جو چھوٹوں کو سڑک پر چلنے کی اجازت نہ بھی دینے کو تیار تھیں۔ وہ کلو آکر جس نے اپنے ”بدیاس“ چھوٹے بھائی کی ناسوک اپنے گھر بسالی ہے۔ اور اس کا اپنا بڑا بھائی دیو کمار۔“

”وہ شخص جس نے باغ میں جھاڑی کے پیچھے سے طنز یہ قہقہہ لگایا تھا۔ وہ“

”چھ آنے۔“

”کچھ کم کرو۔ دوست۔ لیکن یہ کیسی بے گی۔“ بک نے بڑا
کھوتے ہوئے کہا۔ ”اسکے کیا کہنے۔“ بڑا عمدہ ڈیزائن ہے۔ اس نے
ہاتھ پھیلائے ہوئے کہا۔

”بڑا عمدہ ہے تو میں نہیں لوں گا۔“ کیوں۔ کیا بات ہے
”آخر بڑے کے سوا تمہارے پاس اور کوئی لفظ نہیں مھتا۔
نہایت عمدہ کہتے۔ بہت عمدہ کہتے۔ خوب عمدہ کہتے۔ اور کچھ نہیں کہہ سکتے
تھے تو چھوٹا عمدہ ہی کہتے۔۔۔۔۔ بڑا۔۔۔۔۔ آخر بڑا عمدہ
ہوتا کیا ہے۔“

نکلتا تو فروش کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں دام کی جگہ ٹکٹا دی واپس آگئی۔

(۲)

کل لاہور میڈیکل کالج میں داخل ہو گیا۔ لاہور کی دھبیاں کل کے محل
سے کشمیر کی یاد کو دور نہ کر سکیں جھنوری باغ کی پچھلی طرف مہاراج گنج کے
سرے پر اس کا مکان۔ جس کی کھڑکیوں سے دور تک ٹلن کا پانی دکھائی دیتا
تھا۔ جس کے پرے کنارے پر شکر آچار یہ کی پہاڑی ایک عجیب غنائی سے کھڑی
تھی۔ اور پھر اسکے کمرہ کے عین سامنے آگاہو چنار۔ جس کی چند شاخیں کمرے
کے اندر تک آگئی تھیں۔ اور جس کی ایک شاخ پر ایک کوئل نے گھونسلہ بنا رکھا
تھا۔ اس کوئل کی آواز بہت رسیلی تھی۔ کسم کی طرح۔ اور پھر کسم بھی تو اسے
بہت یاد آتی تھی۔ لاہور کے میڈیکل کالج کی خوبصورت اور شونخ لڑکیاں

مال روڈ پر شام کے وقت ٹہلنے والی بلبلیں۔ ٹانگوں میں بیٹھی بیٹھی اپنا مک کسی کو دیکھ کر مسکرا دینے والی تسلیاں۔ اور خصوصاً اسکی ہم جماعت صغیرا جو اسکے کشمیری حسن پر بے حد فریفتہ تھی۔ یہ سب مل کر بھی اسکے دل سے کسم کا خیال دور نہ کر سکیں۔ حالانکہ وہ خود کئی مرتبہ سوچتا کہ ”آخر کسم میری کون ہے۔“ اس کا جواب اسکے پاس کچھ نہیں تھا۔ لیکن اُسے اپنے دماغ سے نکال دینا اسے اپنی طاقت سے بعید نظر آتا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ چاہا کہ کسم کو خط لکھے لیکن پھر وہ بھی سوچتا کہ ”وہ اسکی کون ہے۔“ خط سے وہ کیا سمجھے گی۔ اور وہ پہلی لکھی ہوئی سطر پر خط کھینچ دیتا۔ کئی بار اُسے خیال آتا کہ ”محبت کی طرف نہیں ہو سکتی۔ ضرور اُسے بھی مجھ سے کچھ نہ کچھ اُنس ہے“ لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ اپنے آپ پر سنسن دیتا کہ ”اگر کچھ اُنس ہوتا۔ تو یہ بہترین موقع تھا۔ اسکے اظہار کا۔۔۔۔۔ اگر میں نے کوئی خط نہیں لکھا۔ تو وہی لکھتی۔“

اسی طرح کل کو لاہور آئے ہوئے کچھ مدت گزر گئی۔ کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں۔ اسی سال کالج کی جانب سے ایک پارٹی کیلڈش پرزنت کی ایک چوٹی سر کرنے کی غرض سے بھیجی گئی۔ کل اسی کے ساتھ چلا گیا۔ وہاں ایک بار گر جلنے کے باعث اس کی ٹانگ کو ضرب لگ گئی۔ اسکے ساتھیوں کا بیان تھا کہ شدت درد سے جب وہ بیہوش ہو گیا تھا۔ تو کئی مرتبہ اسکے منہ سے ”کسم“ کا نام نکلا تھا۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ ”کسم تمہاری کون ہے۔“ وہ خمی ہو گیا۔ اور اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ کہ ”وہ میری کون ہے۔ جسے میں خواہ

بے سود سمجھا ہوا۔ تو کیا انہوں نے کل کے پہنچے بغیر ہی دیوکار کی شادی کر دی ہوگی۔ یقیناً گوری ہوگی۔ آخر چھوٹے بھائی کے پہنچنے نہ پہنچنے کی وقعت ہی کیا ہے۔

(۱۲)

کل تانگے سے اترا۔ شام کا دھند لکا چھا رہا تھا۔ ابھی اس کے گھر میں سے کسی نے اُسے نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ فوراً شور مچ جاتا خصوصاً نہاتا تو سنی۔ اُسے معلوم ہو جائے۔ تو وہیں سے شور مچاتا ہوا بھاگے۔ اس نے تانگے والے کو پیسے دیئے۔ سامنے ہی اُس کا کمرہ تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اُگا ہوا وہ چنار جس کی ایک شاخ پر کوئل نے گھونسل بنا رکھا تھا۔ لیکن اب وہاں گھونسل نہیں تھا۔ اُسے اپنے کمرے میں بھی جتنی جلتی دکھائی دی۔ شاید اس کے کمرے پر کسی نے قبضہ جمالیا تھا۔ اچانک دروازہ کھلا۔ دیوکار باہر نکلا۔ کل نے اُس کے بڑھ کر ہنسنے کی۔ دیوکار پیچھے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کسے دیکھ رہے ہو بھئی۔ ”تمہاری بھابی آئی تھی۔ جہاں نے کہاں لہ گئی۔“

اتنے میں اندر سے کُسم آتی دکھائی دی۔ دیوکار کہنے لگا۔ ”لو تمہارا دیوکر بھی آخر آ پہنچا۔“ اس نے سمجھا تھا۔ کہ شاید یہ نہ آئے گا۔ تو شادی ہی نہ ہوگی۔

کل محض اتنا ہی کہہ پایا ”مجھے افسوس ہے۔“ اور چلا گیا۔ دیوکار نے سمجھا کہ کل نے مجھے جواب دیا ہے اور کُسم

سمجھی کہ یہ بات اُسے کہی گئی ہے۔ — کمل کو گلی میں کلو اگوبرلا۔ جو اپنی بہو کو ساتھ لئے کہیں جا رہا تھا۔ غالباً اپنے بدماں چھوٹے بھائی کو چھوڑ کر جھنڈی باغ کی ٹکڑ پر اسی بی۔ اے پاس نکٹائی فروش نے نکٹائیوں والا ڈنڈا اسکی جانب بڑھاتے ہوئے ایسی نظروں سے اسکی جانب دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ "تہیں کسٹم سے زیادہ ایک نئی نکٹائی کی ضرورت ہے۔ — کمل بابو"

۱۹۴۲ء
لاہور۔ جنوری

دان

نوکری سے پٹایا گیا نوکر سیٹھ باری لال کے پاؤں پکڑ کر گرہا رہا تھا۔
 سیٹھ صاحب اپنے اپنے مالوں سے مجھے اُن کھلایا۔ سب کچھ کیا۔ اب میری تنخواہ
 سے بیجرمانہ وصول نہ کریں۔ سیٹھ صاحب ایک کھٹے گھڑے کی طرح بھیگے بغیر رہتا
 بے اعتنائی سے تازہ اجلہ پڑھ رہے تھے۔ اور نوکر اسٹیکوں میں آفسور دے کے
 ہوئے کہہ رہا تھا۔ مہاراج میری پونجی یہی ہے۔ ان ہی روپوں سے میں نے
 اب اور کچھ نوکری نہ ملنے تک نہ جانے کتنے دن یا مہینے گزارنے ہوئے میری
 آنکھ روپے تنخواہ میں سے سات روپیہ جرمانہ وصول کرنے سے مہلاج آپکا
 تو کچھ نہیں بنے گا۔ لیکن میرے کئی مہینے بھوکا اور افلاس سے بھر جائیں گے۔
 میرے لئے آنے والے دن رات کی طرح گارے ہو جائیں گے۔ لیکن سیٹھ صاحب
 پر ان باتوں کا ذرہ بھر بھی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے نہایت منصفانہ طور پر کہا۔ مہتمم
 نے میری پچاس روپے کی چیز کا نقصان کر دیا۔ اور میں نے تمہیں سات روپیہ جرمانہ

کر دیا۔ تو کیا آفت آگئی؟ اس وقت رلدور سوئیے کی آنکھوں میں بیٹھا ہوا پانی چل پڑا۔ اس نے کہا: حضور آپ کے پچاس روپوں اور میرے سات روپوں میں کیا مناسبت۔ میرے لئے ان سات روپوں کا مطلب کئی مہینوں کے فاقے ہیں..... اور نہ سہی۔ تو آپ سمجھ لیں۔ کہ ایک غریب کو دان ہی کدو دیا تھا میں نے کبھی ایسا دان نہیں سمجھا۔ اس خشک جواب نے غریب کی تمام مہیروں کا گلا کھونٹ دیا۔

چند ماہ بعد سیٹھ صاحب کو کار کا ایک حادثہ پیش آیا۔ بہت شدید حادثہ تھا۔ سیٹھ جی کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اور د جانے کون انہیں اٹھا کر ہسپتال میں چھوڑ گیا۔ اسکے بعد پھل پیدا ہو گئی۔ ہسپتال کے دروازوں پر موٹرول کا جو م نگنے لگا۔ اور ڈاکٹروں کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دوڑنے لگی۔ مگر سیٹھ صاحب جیک ہو کر گھر واپس آئے..... چند دن کے بعد ڈاکٹر کابل منیچا بنیم نے بل کھڑا۔ اور ہکا بکا سارہ گیا۔ سیٹھ صاحب نے پوچھا: کیوں۔ کتنے کابل ہے؟ بنیم نے سسٹ سی آواز میں بتایا: چار ہزار روپیہ کا۔

”چلو میرا بھڑا؟ سمجھ لیں گے کہ دان کیا تھا۔ بنیم کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آسکا“

لاہور۔ فروری ۱۹۳۹ء

غلامی

بہت سال ہوئے۔ اس کے ماں باپ کو ایک شکاری پکڑ لایا تھا۔ اور
 شہر سے باہر کی طرف بنے ہوئے اونچی اونچی سلاخوں والے چڑیا گھر میں
 ہی بستے تھے۔ چند ماہ تو آزادی کا گھاؤ تازہ رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ آزادی کی تڑپ
 اسے پیاد میں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی۔ اور پھر یہاں تک نوبت پہنچی کہ انہیں
 قید کوٹھڑی کے سبھجوں سے ہی انس ہو گیا۔ اور اب تو ان سبھجوں کے ساتھ بدن
 رنڈ رنڈ کر گری پیرا کر رہا ہی ان کا کام تھا۔

ناشر دیکھنے بے لگے آنے والوں کی زبان سے ”بے پارہ پنجرے کا شیر“

مُن سنکرا نہیں راحت ملنے لگی۔ اور سچ پوچھو تو جس دن لوگان کی غلامی کا نظارہ دیکھنے نہ آتے ان کی طبیعت کو چین ہی نہ آتا۔ کہاں وہ پہلے دن کہ غلامی کی شرم کے مارے وہ منہ باہر نہیں نکالتے تھے۔ اور کہاں آج کہ انہیں بے چارہ پتھرے کا قیدی، کہلانے میں راحت محسوس ہوتی۔ اور اگر کوئی چلتا پھرتا اپنے ساتھی سے یہ کہتا: ”اگر کہیں بے جنگل میں ہوتا تو تم اور مجھ جیسے سینکڑوں کو اب تک کچا چبا گیا ہوتا“ تو یہ سنکر ہی جیسے ان کی دلیری کا مقصد پورا ہو جاتا جنگل میں ایک نئے اور مشکل پورائے والے شکار کو مار کر جتنی راحت ان کو محسوس ہوا کرتی تھی۔ بالکل یہی حالت یہ باتیں سننے سے ان کی ہو جاتی۔

اسی جگہ وہ پیدا ہوا تھا۔ اس نئے پیدا ہونے والے کو تو کوئی دکھ ہی نہ تھا۔ وہ تو غلامی کی پیدائش تھا۔ جب ماں باپ آزادی کو بھول چکے تھے۔ اس کے لئے تو غلامی کو ہی آزادی سمجھنا پڑتی تھی۔

جب اسکی معصومیت چنداں دور ہوئی اور وہ گوشت پر چھٹنے کی مہارت کرنے لگ گیا تو ایک روز اس نے ماں سے پوچھا: ”ماں! یہ جورات کو ہمارے مکان کے باہر آکر چیخا کرتے ہیں یہ کون ہیں؟“ ماں نے کہا: ”بیٹا۔ وہ گیدڑ ہیں بہت ڈر لوک ہوتے ہیں۔“

اس نے کہا: ”ہم کون ہیں؟“ جواب ملا: ”شیر“ بیٹے نے پھر پوچھا: ”شیر اچھے ہوتے ہیں یا گیدڑ؟“

ماں نے کہا : بیٹا شیر سب اچھا ہوتا ہے۔ ہم ان سب کے راج ہیں اور بیٹے کو پیار کر کے کہا : اور تم شہزادو !

بیٹے نے شہزادگی کے رعب میں آنکھیں میٹکا کر جبر ٹا کھو کر اور لمبی لمبی اور سخت مونچھوں کو ہلا کر اپنے پورے ناخن باہر نکال لئے اور اس زور پہنچا مارا کہ سامنے پڑا ہوا گوشت اسکے ناخنوں میں پھنس گیا۔

اس رات جب گیدڑ آئے تو غلام شہزادہ نہایت رعب آنکی طنز آبا اور نمکنت سے بولا : ”اے شرم نہیں آتی۔ گیدڑ ہو کہ ہمارے سامنے بولتے ہو“

ایک گیدڑ پیچے نے جواب دیا : تم سے تو پھر بھی اچھے ہیں جو آزاد ہیں تمہیں تو غلام ہو کر بھی شرم نہیں آتی“

شہزادہ ماں کے پاس بھاگ آیا : ماں ! غلام اور آزاد کیا ہوتا ہے؟

ماں کے دل میں آزادی کا گھاؤ نہ جانے کب کا مل چکا تھا۔ لیکن آج بیٹے کی زبان غصے کچھ ایسا چرکہ لگایا کہ گھاؤ کے تمام بند ٹوٹ گئے۔ اور اس خون بے تحاشہ آنکھوں کے راستہ بہنے لگا۔ بیٹے نے جب ماں کو روٹے دیکھا تو اسے بہت تکلیف ہوئی۔ اس نے سمجھا : میں کتنا کم عقل ہوں۔ نہ جانے کتنی بری چیز کا نام میں نے لیا ہے۔ جو ماں کو اتنی تکلیف ہوئی“

اس واقعہ کے بہت دنوں بعد..... ایک دن ایک چھوٹے سے

گیدڑ کے بچے نے نہایت رازداری کے لہجے میں اس سے پوچھا یہ بھی کیا تھیں
 آواز کی کا کبھی خیال نہیں آتا؟
 اتنا سنتے ہی شیر بچہ بلک بلک کر رو پڑا۔ اور اسے ہاتھ سے روک کر
 کہنے لگا۔ میرے سامنے اس چیز کا نام نہ لو مجھے یہ سنکر بہت تکلیف ہوتی
 ہے۔ افسرانہی تکلیف وہ اور بری چیز کا نام میرے سامنے نہ کیوں
 لیتے ہو؟

لاہور۔ اپریل ۱۹۳۹ء

کنبہ کے بعد

کافی دیر تک ہاتھ میں درانتی پکڑے وہ اسے دیکھتی رہی تھی۔ کھد کے
پکڑے۔ شام کے سوچ کی ترجمی کر میں اسکے منہ کو لال بنا رہی تھیں۔ اس نے
اپنا سر ریوے لاشن کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ اور پتھروں میں ہی سو یا ہوا تھا
بے خبر جیسے بہت ہی تھکا ماندہ ہو۔

کھیتوں میں آگئے پر بھی وہ بار بار دیکھتی ہی رہی۔ نہ جانے کیوں شاید
اس لئے کہ وہ اس کی آنکھوں کو خوبصورت نظر آیا۔ اور اس لئے بھی کہ
وہ پہرہ ویسی تھا۔

اس کے چلے جانے کا خیال دل میں بار بار آکر اُسے جی بھر کر دیکھنے کو
مجبور کر رہا تھا۔ ایسے ہی جیسے ایک رنگینان کا پیاسا بے جانتا ہوا کہ پھر نہ

جانے کب اس کے درشن ہو گئے۔ پانی کو جی بھر کر پینا چاہتا ہے۔
 شام کے چھ بج گئے تھے۔ ہر دوار سے آنے والی شام کی گاڑی صرف
 دو فلائنگ وور جو الاپورسٹیشن پر کھڑی تھی۔ انجن چلنے کی سیٹی بھی سناٹی دی۔
 وہ مسافروں سے ہلا نہیں۔

گھاس جھیلی پھلتی کے ہاتھوں سے درانتی گر گئی۔ اسے آج پہلی بار
 محسوس ہوا کہ ان کا کھیت ریلوے کی پٹری کے نزدیک ہوتا ہوا بھی اس
 سے بہت دور تھا۔

اس کے پاؤں میں دو چار کانٹے بھی جھاڑی میں سے چھب گئے تھے۔
 لیکن پھر بھی وہ بھاگ رہی تھی۔ بے غم تھا۔ اتنے میں انجن نے ایک
 زبردست چیخ ماری۔ مسافر کی آنکھ کھل گئی۔ لیکن..... انجن بالکل
 پاس آگیا۔ اپنے پورے زور میں۔ وہ آدھا کھڑا ہو گیا تھا۔ لیکن انجن کی سبیت
 ناک شکل چند قدم پر ہی دیکھ کر اسے اپنا بچنا ناممکن نظر آیا۔ سرچا اگیا مگر
 اتنے میں کسی نے اسے زور سے باہر کی طرف کھینچ لیا۔ ابھی دونوں
 کھڑے بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ انجن پاس سے انہیں ہوا کا ایک
 زبردست دھکادے کے گزر گیا۔

نیچے ایک طرف کو ایک کھٹہ نفی۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے
 آپ کو اس کھٹے میں پایا۔ اور۔۔۔۔۔

جیسے چاند کو آگ لگ گئی ہو۔ اور کالے کالے بادل اس کے گرد جمع
 ہو گئے ہوں۔ البتہ ہی اسے محسوس ہوا۔ جب اس نے اپنے پاس ہی پڑی

ہوئی ایک خوبصورت لڑکی کا ماتھا خون سے رنگا ہوا دکھایا۔ اسکے بال کھل کر اسکے منہ پر آگئے تھے۔ اور وہ خود بخود ہوش ہو چکی تھی۔
 وہ جلدی سے اٹھ کر اسکی طرف جانے لگا۔ تب اُسے یہ بھی پتہ لگا کہ اسکی ٹانگے کام کرنے سے جواب دے دیا تھا۔ اور کہ اسکے بدن میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اسکے بعد..... جیسے یہ سب کچھ محسوس ہونا پھر سے بند ہو گیا۔ اور پھر دیکھنا بھی۔ سننا بھی۔ اب وہ پھر شرت درد سے بیہوش ہو گیا تھا۔

اس مسافر کو بہت دنوں تک ہوش نہیں آیا۔ ہوش آنے پر اسے یہ پتہ لگا کہ وہ چاروں کے گھر میں ہے۔ ایک بوڑھا تھا۔ ایک بڑھیا۔ اور وہ..... لڑکی جسکو اس نے اپنے ساتھ کھڑ میں پڑے پایا تھا۔ اسکا نام تھا چمپا.....
 چمپا کو جیسے اور کوئی کام ہی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ سارا دن مسافر کا ہی کام کرتی رہتی۔ روز و شید جی سے حقیقت بیان کرنے جانا۔ دوائی لانا۔ امد پھر اسے دوپہر کو باہر کھیتوں میں درختوں کے سائے میں لٹانا۔ اور اسکی تیمارداری کرتے رہنا۔ جب بھی مسافر نے اپنی کمزور آنکھوں کو کھولا۔ چمپا کو اپنے منہ کی طرف منگنی لگائے ہوئے پایا۔

مسافر دھیرے دھیرے کچھ کچھ چلنے کے قابل ہو گیا۔ اسے باہر نالے کے کنارے سیر کرنے کے لئے چمپا ہی لے جایا کرتی۔ مسافر کو تو فرحت سی محسوس ہوتی ہی۔ لیکن چمپا جب اسکا ہاتھ پکڑ کر چلتی۔ تو اسکے بدن میں

چمپا نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر فقرہ بھی ختم نہ کرنے دیا۔ اسکی آنکھیں بھراؤں میں۔ اس نے کہا، "ایسا نہیں کہا کرتے۔"
پھر مسافر نے اسے سمجھایا کہ اسے جانا ہی ہو گا۔ تب اس نے رنجیدہ خاطر ہو کر کہا:-

”تو پھر کب ملیں گے..... مسافر!“
”اگر بھگوان کی اچھیا ہوئی۔ تو کبھ کے بعد!“
اس کے منہ سے نکل گیا، ”کبھ کے بعد“ اور پھر ایک آہ سی نکل گئی۔ پھر اس نے کہا، ”کیا کبھ کے بعد ہم اکٹھے رہ سکیں گے؟“
”کیوں نہیں“
”کس طرح؟“

مسافر نے کہا، ”شادی کر کے“
”ہماری شادی کون کریگا؟“
”تم گھبراتی کیوں ہو چمپا۔ جب پریم کرنا سیکھی ہو۔ تو اسکی ریت بھی سیکھو۔ ہم خود ہی دیوی کے سامنے شادی کر لیں گے۔“
بالآخر وہ دن بھی آیا۔ جب مسافر جیت پور چھوڑ کر جانے لگا۔
مسافر نے ایک بار چمپا کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسکی آنکھوں میں بہت دیر تک اپنی آنکھیں ڈالے رکھیں۔ اور پھر چل دیا۔
دو ہی قدم کے بعد اُسے آواز آئی:-
”مسافر! وہ پھر ٹھہر گیا۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز سے وہ بولی:-

”اپنا نام تو بتاتے جاؤ۔ دیوتا!“

”کشور چند..... کیا کچھ اور؟“

”اور.....؟ اور اب کنہد کے بعد؟“

اور دوسری صبح سے پہلے کئی سڑکیں۔ کئی مکان اور سب سے بڑھ کر گنگا کا
دریا ان دونوں کے درمیان حائل تھا۔

کنہد میں اب صرف چار دن رہ گئے تھے۔ اگلے گاؤں میں عجیب سی کام
چوچا ہوتا رہتا تھا۔ چپا کے لئے یہ چار دن بیٹنے کی مشکل ہو رہے تھے۔

جب اگلے گاؤں میں سے اس پاس کے راجپوت زمینداروں کے رنڈ
کنہد کو جاتے ہوئے گزرے۔ تو وہ بھی اتنے میں کھڑی رہتی۔

اسے ایسا محسوس ہوتا۔ جیسے اسکے دل سے ایک خاموش سندیسہ نکلتا ہو۔
کشو کے نام پر میرے کشور کو کہنا کنہد کے بعد نہ بھولے!

پھر اسے کچھ راحت سی محسوس ہوتی۔ جسے رنڈ کے پیچھے میں میں کی تلواریں
میں اس سے کہہ رہے ہوں ”تم گھبراؤ نہیں۔ ہم کشو کے دیس کو جا رہے ہیں۔
اُسے ضرور کہیں گے!“

اور اسکے تھرتھرتے ہوئے لبوں میں سے جیسے کئی بوسے ان رنڈوں کے
ساتھ ہو لیتے۔ کشو کے دیس کی طرف بھاگتے ہوئے۔ اور وہ کھڑی دیکھا کرتی
کنہد سے آنے والوں کی راہ۔

آخر ایک رات اس نے سنا۔ کنہد بھڑکتی گزر گیا۔ اس پرستی کی چھاٹی

ہوئی تھی۔ وہ اگلے آنے کا تصور باندھتی رہی۔ دوسرا دن اسی ادھیڑ میں باپ گزرا۔ وہ رات اسکی کٹی مہینوں میں ختم ہوئی۔ اور دوسرا دن اسکو کو تو جیسے گزرتے سال ہی لگ گیا ہو۔

شام کے وقت گاؤں کے مزدور آئے۔ تو یہ چوپال کے پاس ہی کھڑی تھی۔ کدوؤں نے چار پائی پر گرنے ہوئے وہاں بیٹھے پڑھے سے کہا: ”گوپال دادا۔ آج تو تباہی آگئی۔ بالکل تباہی۔ جیسے پرے آگئی ہو!“ اس نے بڑی بے صبری سے پوچھا: ”کیا ہوا۔ کیا ہوا؟“

”آگ۔ چاچا۔ دھوڑی بازار۔ وہ جس کی بابت میں نے تمہیں کہا تھا کہ سارے ہرودار میں اتنا مال نہیں۔ جتنا صرف اس گنگا پار پھونس کے بنے ہوئے بازار میں تھا۔ مینا بازار تھا۔ مینا بازار۔ رات کو تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اندر پوری جس کا حال پنڈت جی سنایا کرتے ہیں۔ اس میں آگ لگ گئی۔ اُن کیسی آگ تھی۔ چاچا سب سوا ہوا گیا۔ قسم کھانے کو کوئی دکان نہیں بچ سکی۔ سارا بالکل سارا جل گیا۔“

”کوئی آدمی تو نہیں جلا؟“

”ہاں ایک آدمی بھی جل کر محروم ہوا۔ وہ بیچارہ برہمن تھا ایک نوجوان برہمن۔“
چپا کے سیلے میں جیسے غم کا ایک طوفان اُٹھ آیا۔ وہ مضبوط کر کے اٹھانے ہی میں اسکے پاؤں اسی راستے پر جا رہے تھے۔ جو کنیا گوروکل کے پاس کھوتا کنکھل کی طرف سے ہر دھار کو جاتا تھا۔ اب بھی کچھ آدمی اپنے اپنے گاؤں کو آ رہے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے اس جگہ تک بھی پہنچ گئی۔ جہاں بچھرتے ہوئے مسافر

نے اسے کہا تھا کہ میرا جو کچھ کنبہ روپی یگیہ سے بچ جائیگا۔ وہ تمہارا ہو گا۔
وہ کچھ دیر کے لئے کھڑی ہو گئی۔ دور سے چارپانے آدمی کٹھے آ رہے تھے۔
وہ پھر نہ جانے من جیالوں میں محو ہو گئی۔ کسی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

”کیا جگجیت پور کا گاؤں کہیں پاس ہی ہے؟“
اس نے دیکھا۔ ان نوجوانوں نے ایک چارپائی اٹھا رکھی تھی۔ اس نے جواب دیا۔
”ہاں..... کیوں؟“

”اس لاش کو وہاں پہنچانا ہے۔“

”یہ کون ہے.....؟“

”روڑی کی ہگ میں سخت زخمی ہوا ہے۔ ایک بار اسے تھوڑا سا ہوش
آیا تھا۔ اور اسکے منہ سے نکلا تھا۔ مجھے مرنے کے بعد جگجیت پور بھیج دینا ضرور
..... چاروں کے گھر ایک چمپا ہے۔ اور.....“ اور پھر بہوش ہو گیا تھا۔
اپنے آپ پر قابو رکھ کر وہ بولی۔ چارپائی کو نیچے رکھ دو۔“

وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اور ان آدمیوں سے کہنے لگی آپ لوگ
جاؤ۔ جہاں انہوں نے پہنچنا تھا پہنچ گئے ہیں۔“

ہرموار۔ اپریل ۱۹۳۸ء

زودیشیان

شاعر اپنی دھن میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اور اسکے کمرہ میں رہنے والے دوسرے دوست تھیوں کے درمیان ایک معمولی سا جھگڑا ہو گیا تھا۔ یہ وہ جھگڑا تھا۔ جو خیالات و آراء کی مخالفت سے نہیں بلکہ تطابق سے پیدا ہو جاتا ہے۔ فیض نے کہا کہ نہیں وہ اس مسئلہ پر بدکار نہیں ہے جتنا کہ اس کے متعلق مشہور کیا جاتا ہے "خیر اُستی لال نے اپنی عینک تاری لی اور اُسے کپڑے سے صاف کرتے ہوئے اپنی ایک سُرُخ آنکھ کی سُرُخی کو زیاہ نمایاں کرتا ہوا بولا۔

"تہیں ان باتوں کا علم ہی کیا ہے۔ گذشتہ سال بھی وہ انہی کوڑوں میں بنی اور مجھے تمام حالات اچھی طرح معلوم ہیں۔ کوئی ایک دو ہوں تو کچھ بات کہی ہے

لیکن جتنے مردوں سے اسکا تعلق ہے انکی گفتی کرتے بھی شرم محسوس ہوتی ہے
اما۔ میں نہیں سمجھتا کہ آخر تم اس خوبصورت لڑکی کی اس قدر حمایت کیوں کرتے
ہو۔ کہیں تم بھی اسکے۔۔۔۔۔

لڑکے کے لفظ نے شاعر کی فوری توجہ اپنی جانب کھینچ لی خوبصورت لڑکی کے
لفظ پر شاعر کا توجہ نہ دینا گویا شاعری کے نام پر کلنگ کا ٹیکہ لگانا ہے۔ اسلئے وہ
بھی فوراً انکی بحث میں شامل ہو گیا۔

اس بات چیت کے دوران میں کئی ڈاکٹروں کئی سرکاری افسروں اور
کالجوں کے لڑکوں کے نام بار بار لٹے گئے۔ ان سبکے متعلق ایک ہی شک کیا جاتا
تھا کہ انکا تعلق اس خوبصورت لڑکی "اصغری" سے ہے۔ شاعر بحث میں شامل تو تھا
لیکن دل سے نہیں بلکہ اسکی شمولیت اپنے دونوں ساتھیوں کی محققانہ باتیں
سننے تک ہی محدود تھی۔

خیر اتنی لال نے بحث ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ اچھا ہاتھ
کنگن کو آرسی کیا۔ اب پھر وہ یہاں آگئی ہے۔ چند ہی روز میں دیکھ لینا کہ کس طرح
کھل کھلتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن شاعر نے اس کی یہ بات نہیں سنی۔ اس کی
آنکھیں سامنے والے کو ارٹھر میں کسی چیز پر اٹک گئی تھیں۔ اس کو ارٹھر سے
لطفہ برآمدہ میں کوئی خوش جمال لڑکی اپنے چھریے بدن کو نہایت دلکش انداز
سے ہلاتی ہوئی ٹہل رہی تھی۔ ان دونوں کو ارٹھر کے درمیان زمین نشیب
میں جاتی ہوئی ایک چھوٹی سی گھاٹی کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ جس میں
چیل کے درختوں کی بہتات تھی۔ وہ لڑکی خود پر کسی کی مرکوز نہ تھا ہوسکتے خبر

چہل قدمی کرتی ہر ٹہنی کبھی کسی درخت کی آڑ میں ہو جاتی اور کبھی پھر وہ درختوں کے درمیان سے جلوہ ریز ہوتی۔ لیکن شاعر کی آنکھوں میں اسکے پہلے ہی جلوہ لے کچھ ایسی چکا چوند پیدا کر دی تھی کہ اُسے یہ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ کب اور کہاں کوئی درخت اسکے جلوہ کو آڑ دے دینا تھا۔ بلکہ اس کی آنکھوں سے تو جیسے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اوجھل نہیں ہوئی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ سامنے کے برآمدہ کی تمام لمبان پر ایک حسین سنہری خطا کھینچ دیا گیا ہے جو بیک وقت اس کو نہ سے لے کر اس کو نہ تک سائے کا سارا جگمگا رہا ہے۔

دونوں دوستوں نے بحث ختم کر کے شاعر کی جانب دیکھا کہ شاید وہ کوئی فیصلہ کن بات کہے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک چمک و دونوں چونک پڑے۔ انہیں اس چمک کا راز اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا۔ جو اسی وقت پیدا ہوا کہ تیغی جب شاعر پر کوئی غیر معمولی جذبہ طاری ہوتا تھا۔ اپنی ایک سُرُخ آنکھ کو اس جانب گٹھتے ہوئے خیراٹی لال نے پوچھا —
 ”کیا ہے؟“

شاعر نے آنکھیں جھپکے بغیر سر ملا کر اشارہ کیا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا خیراٹی لال نے خود ہی اس کی جانب سے سوال پوچھا: ”دھڑکی؟ لیکن تو جو جینے سے سکا۔ فیض احمد اچانک سوچ اٹھا: ”وہی تو ہے۔ وہی تو ہے“ شاعر نے لب عجب انداز سے ہلے: ”امغری۔۔۔۔۔“ فیض احمد نے فوراً کہا: ”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ وہی۔۔۔۔۔“ ”کیا اسے اسی کارٹر میں جگہ دی گئی ہے؟“ اس کے بعد فیض نے اور نہ جانے کیا کچھ کہا لیکن شاعر نے کچھ نہیں

سنا۔ اس خبر نے اسکی حیرانگی میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ
حسن کا مجسمہ بھی اپنے ماتھے کو واغدار بنا سکتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی
اس کی شاعرانہ روح کانپ اٹھی۔ اس نے سوچا کہ کیا بلور کی مانند شفاف
پانی کے کیف زائچہ کی تہ میں بھی کیچڑ ہو سکتا ہے۔ ————— نہیں —————
نہیں۔ اس کے دل سے ایک آواز آئی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس پانی
کا بلورین رنگ ان موتیوں کی آب کا مرہون ہے جو اس کی تہ میں ڈول رہے
ہیں۔ نہیں۔ وہاں کیچڑ نہیں ہو سکتا۔ ————— شاعر کو قدے تسکین ہو
گئی۔ گویا وہ کوئی ایسی آواز سننے کا اسطرح خواہاں تھا جیسے کوئی باپ اپنے
بچے کو اپنی آنکھوں سے قبر میں دفنایا جاتا دیکھ کر بھی اپنے سینے میں یہ خواہش
ہو جو دپاتا ہے کہ کوئی مجھے آکر کہے کہ تمہارا بچہ بہت شیطان ہو گیا ہے ابھی
ابھی دیکھو اس نے میرے لڑکے کو پیٹا ہے۔ اور اسے یہ معلوم ہو جائے کہ سب
کچھ۔ موت۔ کفن۔ دفن۔ ————— یہ سب کچھ ایک لمحائی خواب تھا اور کہ
اس کا بچہ ابھی شرارتیں کرنے کیلئے موجود ہے۔ سیطرہ شاعر نے یہ آواز سنی تو
اسے ایک گونہ تسلی ہو گئی کیونکہ وہ اپنے تئیں روایتی طور پر حسن کا کچھ ایسا
قویٰ ہی تعلقات سمجھتا تھا اور حسن کی ایک ایسی ملکوٹی تصور کر سکے دل پر نقش
تھی کہ حسن کی بد اخلاقی اسکے لئے اپنے بیٹے کی موت ایسی ہی دکھائی تھی۔
نبین شاعر اس مجسمہ حسن کے متعلق اپنی خوش فہمی کا کایج محل زیادہ دیر
تک قائم نہ رکھ سکا۔ خیر امتی لال کی جانب سے عامہ کردہ الزامات کی شکنیں نے
اسے دم بھر میں پاش پاش کر دیا۔ آخر کار شاعر محض یہی کہہ سکا کہ اسی کا

نام شاید دنیا کی تلخ حقیقت ہے۔ جسکی دیواروں سے اونچے اور نش اور معیاری خیالات سر ٹپک ٹپک کر رہ جاتے ہیں۔

شاعر نے اپنے دل سے اس لڑکی کا خیال تک نکال دینے کی کوشش کی۔ لیکن سوء اتفاق۔ کہ وہ اس کو ارٹز میں رکھی گئی جہاں وہ چوبیسوں گھنٹے اسی آنکھوں کے سامنے رہتی جس کا قدرتی انجام یہ ہوا کہ اس نے اصغریٰ کا خیال اپنے دل سے نکالنے کی جس قدر سعی کی اس قدر اس کے دل میں ایک شکست زدہ پکڑتی گئی۔ حتیٰ کہ ایک دن اس نے طے کر لیا کہ وہ اس لڑکی سے ربط و عنبط پیدا کرے اور وہ بھی محض اس لئے تاکہ وہ اسکی بد اخلاقی کی علت غائی معلوم کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنے دل میں یہ خواہش بھی موجود پائی کہ اگر ہو سکے تو اُسے سیدھی راہ پر لے آئے۔

یہ تھا وہ پاک و ملکوتی مثنیٰ جسے لبیک شاعر نے اصغریٰ سے راہ و رسم بدلائی۔ اس راہ و رسم کا آغاز کس طرح ہوا؟ اس سے ہمیں بحث نہیں کیونکہ علم و تعلیم پائے ہوؤں کے درمیان راہ و رسم کی ابتدا کچھ مشکل نہیں ہوتی۔ بہر حال آپس میں کتابوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ شاعر نے اپنا کچھ مطبوعہ کلام بھیجا۔ کچھ افسانے بھیجے جن کی اصغریٰ نے بہت تعریف کی۔

دقت رفتہ شاعر یہ محسوس کرنے لگا کہ اب جب وہ اصغریٰ سے ملتا ہے تو اصغریٰ کے چہرے پر وہ عنبط اور سنجیدگی کے آثار نہیں آتے بلکہ اس کے چہرے پر کچھ تعجب پیدا ہو گیا تھا جس نے سنجیدگی کی جگہ اُسے متبسم بنا دیا تھا۔ گویا کسی ماہر مصور نے اپنے پھر نیلے قلم سے اس تصویر پر میں چند ایسے گہرے ٹیڑھے خطوط کا

اختلاف کر دیا تھا۔ جنہوں نے اس تصور پر کے خدوخال میں جذبات کی گہرائی بھر دی تھی۔ اسکی آنکھوں میں اس ناویدہ تصور نے وہ ایسے منور نقطے جڑیٹھے تھے۔ جنہوں نے ساری کی ساری تصویر پر ایک نور افشاں حنیاء بکھیر دی تھی۔ اسکی باتوں میں وہ پہلی سی ہچکچاہٹ اور اسکی نظروں پر وہ پہلا سا حجاب پرودہ نہ رہ گیا تھا۔ وہ کئی بار اپنی نمکینی پلکوں کو پوری طاقت سے اٹھا کر شاعر کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتی۔

ان دونوں شاعروں نے کئی بار آئینہ میں اپنا منہ دیکھا۔ لیکن اُسے وہاں کوئی خاص جاذبیت یا حسن دکھائی نہ دیتا تھا۔ پھر وہ سوچتا کہ وہ یہاں کیا دیکھا کرتی ہے میری آنکھوں میں کیا دھڑلے؟ جن میں وہ اس طرح اپنی نظریں گاڑ دیتی ہے گو یا وہ تنہی نظریں میری آنکھوں کی سطح کو بیکہ بیکہ کرائی نہ میں کچھ ڈھونڈ رہی ہوں۔ پھر اُسے خیال آیا شاید وہ میرے اشعار میں پائے جانے والے جذبات کا حقیقی مسکن ڈھونڈتی ہے۔ تو گو یا وہ میرے جذبات کی قدر کرتی ہے۔ اپنی خاموش مدح کا یہ خیال اس میں کچھ ایسا سرور پیدا کر دیتا کہ اُسے آئینہ میں اپنا چہرہ اتنا حسین و جاذب دکھائی دینے لگتا۔ کہ وہ کئی بار اُسے چوم لینے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن یہ کیفیت بہت دیر تک نہ رہتی۔ دوسرے ہی لمحہ میں جب اسے اپنے حسین مداح کی سیاہ کاریوں کا خیال آتا۔ تو گو یا آئینہ میں اسکے چہرہ پر کوئی سیاہ پت دیتا۔

رفتہ رفتہ کتابوں میں چھوٹی چھوٹی تخریریں آنے جانے لگیں جتنی کہ اصغر ی کے ایک خط نے شاعر کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس نے لکھا تھا۔

”آپ کی تمام چٹھیاں ملیں۔ شکریہ۔ آپ مجھے یہ کہنے کے لئے معاف کریں گے کہ میں آپ سے یا کسی اور سے غیر ضروری قرابت نہیں رکھ سکتی کیونکہ اس طرح میری عزت پر دھبہ لگتا ہے۔ آپ یہاں کے لوگوں کی ذہنیت شاید نہیں جانتے کہ وہ کس طرح رانی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں اور انکی عجیب جوا ٹھکیں دوستیوں کے درمیان کسی بھی تعلق کو بڑے پہلو کے سوا کسی دوسرے پہلو سے نہیں دیکھ سکتیں۔
 — اس لئے جو بھی قدم اٹھائیں سوچ سمجھ کر اٹھائیں۔ اگر آپ کسی جذبہ کی رو میں بہ رہے ہیں تو اس کے بہاؤ پر اسی جگہ اور ابھی بہاؤ بند دینا بہتر ہوگا۔“

یہ خط پڑھ کر جیسے شاعر کے سر سے ایک بوجھ سا اتر گیا۔ اعغری کے خط سے صاف ظاہر تھا کہ وہ شاعر کا مطلب سمجھنے لگ گئی ہے۔ ادھر ہی اس کے لئے نہایت حوصلہ افزا تھا۔ کیونکہ جو بات صاف کہنے یا لکھنے سے وہ اچکچا رہا تھا۔ وہ اس نے بن کہے ہی سمجھ لی تھی۔ اب اس کی کسی بھی تخریب کے غلط معنی لئے جانے کا احتمال نہ رہا تھا۔ اور پھر اعغری نے بھی تو اپنے خط میں کسی مزید اقدام کی گنجائش چھوڑ دی تھی۔ گو شرط سوچ سمجھ کر ایسا کرنے کی تھی لیکن شاعر کو اس تخریر میں کچھ کرنے کی دعوت پہنچا دیکھائی دی اس نے قلم اٹھایا اور آخر اسے وہ بات لکھ دی جس کو وہ ابھی تک نہ کہہ سکا تھا۔ اس نے لکھا۔

”نواز ش نامہ ملا۔ شکریہ۔ زیادہ جھیلوں میں نہ پڑ کر سیدھی سادی بات سنئے۔ میں ایک سادہ لوح انسان سا۔ باگل سا شاعر

ہے۔ اور کبھی کبھی دور کناسے ہی سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ غرضیکہ وہ پاگل ہو جانا چاہتا ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اُسے اس پاگل پن سے ہوش میں لانے کی کوئی دوا نہ کی جائے۔ شاید آپ اس کمزور عبارت سے اس حذبہ کی ایک جھانکی دیکھ سکیں۔ ابھی میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن رکنا ہی پڑتا ہے۔ میرا یہ شعر میری ہی حالت کی ترجمانی کرتا ہے۔ ع

یہ شب مختصر سی حکایت ہے لمبی

میں باتیں ہی باتیں کیا چاہتا ہوں

شاعر نے خط ختم کر کے ایک بار پڑھا۔ پڑھنے کے ساتھ ہی وہ حیرت زدہ خط کو دیکھتا رہ گیا۔ آج اس کے قلم نے سہو اُسی یا صبح الفاظ میں ناوانستہ طور پر ایک ایسا مسئلہ حل کر دیا تھا جس کا حل وہ خود ایک مدت سے ڈھونڈ رہا تھا۔ لیکن پریشانی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا تھا۔ وہ مسئلہ تھا "شاعر اور حسن کا تعلق" ایک مدت سے وہ سوچ رہا تھا کہ اُسر کیوں؟ البتہ کیوں ہوتا ہے۔ کہ جب بھی کوئی حسین اس کی نظر رہ جو آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ تو وہ اُس کی جانب ایک غیر مرئی کشش محسوس کرتا ہے! اس سے ملنا چاہتا ہے۔ اس سے کسی نہ کسی طور تعلق کرنا چاہتا ہے۔ یا کم از کم اُسے دیکھنا چاہتا ہے۔ ابھی وہ اس تذبذب میں تھا کہ اُس کو بچاؤ کی بے بسی کو کیا نام دے؟ گناہ؟ کیونکہ اُسے دنیاوی مذاہب کے دنیاوی ٹھیکیداروں نے یہی بتایا تھا۔ کہ ایک عورت کے بعد جسے تم اپنی ملکیت

شاعر کے خط کا جواب آیا۔ اصغری نے لکھا تھا۔

..... "یقیناً میں آپ کے جذبات کی دل سے قدر کرتی ہوں لیکن

حقیقت یہ ہے کہ میں کوئی مبسوط جواب دینے سے گریز کر رہی ہوں۔ ڈرتی ہوں کہ مبادا زیادہ گہرے پانی میں اتر جاؤں اور اندھا دھند کچھ کہ بیٹھوں۔ خدا مجھے میرے تئیں چھوڑ دو۔ اور میرے دل کی شائستگی کو پرجوش ترنگوں کے ہاتھ میں نہ جانے دیجئے۔ گو مجھے اپنے دل پر قابو ہونے کا بھرپور ہے پھر بھی میں ڈر رہی ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنے دل کا توازن کھو کر اپنے عمل کا توازن بھی کھو بیٹھوں۔ اس لئے مجھے یہی بہتر لگتا ہے کہ ہم اپنے سطھی تعلق کو بھی توڑ دیں۔ جو غیر مرنی ٹوڑ۔ یہ گہرا ہونا چلا جا رہا ہے چنانچہ اس خط کا جواب نہ دیجئے گا.....

اصغری نے لکھنے کو تو یہ لکھ دیا۔ کہ جواب نہ دینا۔ لیکن اسکے دل میں جواب کا انتظار موجود تھا۔ خط بھیجنے سے پہلے اس نے کئی بار اس فقرے کو کاٹ ڈینے کی کوشش کی۔ لیکن ہر بار غیر یقینی مستقبل کے متعلق کوئی ڈراؤنا احساس اسکا ہاتھ تھام لیتا۔ اور آخر کار اس نے اپنے ناوان دل کی آواز دبا کر یہ خط اسی حالت میں بھیج دیا۔ لیکن اسکے بعد بھی اسکے دل نے یہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کہ شاعر کو فی جواب نہ دینا۔ شاعر کو تو اس نے قطع تعلقی کے لئے لکھ دیا۔ لیکن اپنی نگاہوں کو بار بار شاعر کے کمرے میں جانے سے نہ روک سکی۔ اور آخر کار اسکے دل ہی کی مراد پوری ہوئی۔

گیا۔ (جسے چھوڑنے کی خواہش شاعر کے دل میں تھی بھی نہیں) لیکن اس دوران میں شاعر نے کئی باتیں ایسی دیکھیں کہ اگر اس کے دل میں یہ چور نہ ہوتا کہ اصغری مجھ سے پاکیزگی کا فریب کھیل رہی ہے۔ تو اُسے یقین ہو جاتا کہ اصغری اس سے "عشش" کرتی ہے۔

بہر حال اس کے جذبات سے بے نیاز شاعر نے اپنا طرز عمل طے کیا! اس نے اصغری کے سامنے کوئی حیوانی خواہش پیش کرنے کی ٹھانی جیسے متعلق اُسے یقین تھا کہ فوراً منظور کر لی جائے گی۔ اور اسکے بعد..... اس نے سوچ رکھا تھا کہ اپنا دامن آلودہ نہیں ہونے دے گا۔ اور کہ عین اس وقت جس وقت بڑے بڑے عابد و پرہیزگار اپنے آپ پر قابو رکھنے کا دعوے نہیں کر سکتے۔ وہ اس کی جانب آنکھیں بند کر کے چلا آئیگا۔ اور اس طرح اصغری کو دکھائیگا کہ "دیکھ۔ انسان پر اس طرح اپنے نفس کا فاتح ہونا واجب ہے" اور اُسے یقین تھا کہ اس واقعہ سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی۔

لیکن شاعر کے یہ سب منصوبے دھڑکے دھڑکے رہ گئے۔ وہ کسی بھی طرح اصغری کو گناہ کی جانب مائل نہ کر سکا۔ اصغری کے اس انکار کا انجام بھی حیران کن تھا۔ اصغری کی جانب سے جوں جوں انکار بڑھتا گیا۔ شاعر کی خواہش ہاتھ چلے جانے والے قمار باز کی طرح تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی! اصغری اگر اقرار نہ لیتی۔ تو شاعر کی گرد و طمش کوک ہونے کا امکان بہت تھا لیکن اسکے مسلسل انکار نے شاعر کی گرد و طمش یقینی کر دی۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے

اس "پاکہاز" شاعر کا مقصد حیات ہی اس لڑکی کو گناہ کے گڑھے میں دھکیلنا رہ گیا تھا۔

انجام کار شاعر ایک روز ایسا بھڑکا کہ اُس نے جوش میں آکر اُسے صاف صاف کہہ دیا کہ "فلاں ڈاکٹر۔ فلاں میڈیکل افسر۔ فلاں انسپکٹر پولیس اور فلاں فلاں طالب علم کے سامنے جس بات سے تمہیں باک نہ تھا اس سے اب کیوں ہے؟"

انصغریٰ کو جیسے کسی نے گولی مار دی۔ وہ غلیل کھاٹی ہوئی چڑیا کی مانند لوٹ گئی۔ اس کی نیم واسننے والی سرنگیں آنکھیں اپنی پوری وسعت میں کھل گئیں۔ جواب دینے کے لئے اس کے لب پھڑکے۔ لیکن کھلے کے کھلے رہ گئے۔ چند لمحے تو وہ اسی حالت میں رہی۔ بعد ازاں کچھ سوچ کر اپنے ٹرنک کے قریب گئی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے کھولا اور ٹیول کرنگھی کپڑے کا ایک بچہ نکال لائی۔ اور اُسے شاعر کے سامنے ٹیک دیا۔ اس کے تھر تھرتے ہونٹوں سے محض اتنا نکلا کہ "خدا را اسوقت چلے جائیے۔ یہ بچہ بیتے جائیے اور اس میں جو کچھ ہے۔ پڑھ کر مجھے لوٹا دیجئے گا" اتنا کہہ کر وہ قریب کھچی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ گویا اُس کی ٹانگوں نے اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر بھی سنبھل نہ سکی۔ اور سر ہانے میں اس نے اپنا منہ چھپا لیا۔ شاعر نے سسکیوں کی آواز سنی۔ لیکن وہ اسکے قریب نہ جاسکا۔ اس نے دوبارہ بچہ اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن نسوانی سسکیوں کی آواز نے اسکے اعصاب پر ایسا اثر کیا کہ انگلیوں کے ارتعاش کے باعث وہ بچہ نہ اٹھا سکا۔ لیکن وہ ان سسکیوں

کی آواز بھی برواشت نہ کر سکتا تھا۔ جنگوبہ کہنے کے لئے وہ اسغری کے قریب تک نہ جاسکتا تھا آخر اس نے اپنے تمام جسم کی طاقت انگلیوں میں مجتمع کر کے اس بیچر کو اٹھا ہی لیا۔ اور خاموشی سے چلا گیا۔

شاعر جوں جوں پٹھتا جاتا تھا۔ اس کی پیشانی سے شرمندگی کے قطرے ٹپکتے جاتے تھے۔ ہر سب انہی لوگوں کے خطوط تھے۔ جن کے متعلق اسغری سے کئی کئی رومانی حکایتیں وابستہ تھیں۔ اور ہر ایک خط میں وہی ایک بات تھی محبت..... محبت..... اور محبت ہر ایک نے اُسے اپنے دل کی رانی بنایا تھا۔ ہر ایک نے اُسے اپنا مقصد حیات بیان کیا تھا جس کے حصول کے بغیر ہر ایک کی زندگی بیکار تھی۔ بعض ایک نے انکار کی صورت میں خودکشی کی دھمکی دی تھی۔ کئی ایک نے اپنی جاں بلب حالت کا دردناک منظر کھینچا ہوا تھا۔ (گو ان میں سے ایک کو بھی آج تک اپنی عیش ترک کر کے بیمار ہونے کی فرصت نہ ملی تھی) شاعر نے اپنے سامنے مردوں کے مکرو فریب کا ایک ٹھاٹھیں مارنا ہوا سا گر دیکھا جس کی اٹھتی ہوئی لہروں کی چپکا سکے پانی کی ڈراؤنی سیباہ صورت پر پروہ کٹے ہوئے تھی۔ جس کے کنارے اُگے ہوئے پھولوں کی باس نے اس کی عفونیت کو ایک ہلکے سے اسپرل سے ڈھانپ رکھا تھا۔ ان تمام خطوط سے ایک اور بات بھی مترشح تھی۔ اور وہ یہ کہ اسغری نے کسی ایک کی جانب بھی اب تک محبت بھری نگاہ تک نہ اٹھائی تھی۔ ہر ایک عاشق زار نے اپنے مسلسل خطوط میں اسی کا گلہ کیا تھا۔ اس سے قبل کہ شاعر

گو یا کوئی شفتیں کہ ان اسکے چہرے پر ٹوٹ گئی ہو۔ اس کا بال بال کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ کچھ جواب دینا چاہتی تھی۔ لیکن جیسے اس کے منہ پر کسی نے ٹالا جڑ دیا ہو۔ اور الفاظ و جذبات اسکے منہ میں ایک بند کرے میں ڈال دیئے گئے۔ شوخ بچوں کی طرح مچل سے تھے۔ آخر کار اس نے ہمت کر کے کہا۔

”لیکن تم سے مجھے.....“ فقرہ ختم ہونے سے پہلے وہ اپنے گھٹنوں پر آ رہی تھی۔ اور بھگی ہوئی آنکھوں اور تھمتاتے ہوئے گالوں کے مشترکہ مس نے شاعر کے پیروں میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی۔ جو بجلی کی دھماکے کی طرح اس کی چوٹی تک پہنچ گئی۔ اصغری کا فقرہ پورا ہو چکا تھا۔ جیسے شاعر نے نشیبی آواز میں دہرایا ”تم مجھ سے محبت کرنے لگ گئی ہو“ جواب میں اس نے ایک ہلکی سی سسکی کے سوا کچھ نہ سنا۔ اس نے اصغری کو اپنے قدموں پر سے ہٹایا۔ اس لئے نہیں۔ کہ اُسے اس فائنڈ انداز میں کھڑے رہنے سے ایک نشہ سا آ رہا تھا۔ وہ اس وقت اپنے تئیں ایک فائنڈ نہیں بلکہ شکست خوردہ سمجھ رہا تھا۔ ایک لڑکی نے آج اُسی کے قدموں پر گر کر اُسے شکست فاش دی تھی۔ اس نے ان الفاظ کی سپائی کو محسوس کر لیا تھا جو زبان سے اوانہیں کئے گئے تھے..... محبت.....

اس لفظ کا اس پر کس قدر گہرا اثر ہوتا تھا۔ اگر اصغری اُسے وہ خطوط دکھا کہ اپنی صفائی پیش نہ کرتی۔ اور تب بھی اُسے سچے دل سے ایک دفعہ کہتی۔ کہ ”میں تم سے محبت کرتی ہوں“ تو وہ اس کی تمام برائیوں کو بھول جاتا۔ کیونکہ شاعر سمجھتا تھا کہ سونا خواہ کتنا ہی کھوٹا کیوں نہ ہو۔ جب بھی وہ

آگ میں پڑے گا۔ تو کندن ہی بکھر نکلے گا۔ اس کے نزدیک ایک بازاری عورت کا بھی سچے دل سے محبت کرنا اُسے زمانہ بھر کی عورتوں سے پاکیزہ تر بنا دینے کے مترادف تھا۔

اس وقتی کیفیت سے جب شاعر نے حقیقی پائی۔ تو وہ اپنے دل میں تمام حالات کا صحیح نظروں سے جائزہ لیتے لگا۔ اس نے کئی امور کا دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔ لیکن یہ بات تو اس نے قطعی طور پر مٹے کر لی کہ وہ اصغری کو کسی دھوکہ میں مبتلا نہ رہنے دینگا۔ اور اسے عاف عاف کہہ دینگا کہ وہ کسی سے محبت کر چکا ہے اور اب بھلی کرتا ہے۔ البتہ اصغری کی محبت کے پاک جذبہ نے اس کے دل میں ایک جوابی جذبہ ضرور پیدا کر دیا ہے۔ جسے احترام کا نام دے سکتے ہیں۔ لیکن وہ احترام اس قدر زیادہ ہے جو محبت سے کسی طور کم نہیں۔

اصغری نے جب یہ سب کچھ سنا۔ تو وہ ہنس دی۔ اس نے کھڑکی سے اپنا بیضوی چہرہ باہر نکالا۔ جو دسویں کے چاند کی میٹھی سی روشنی میں نہ گس کی پتیوں کی مانند سفید و نازک نظر آئے لگا۔ اس کے دماغ میں چند ہی ساعتوں کے اندر اندر گزشتہ واقعات، پھر گئے۔ کس طرح بیسویں حسین دولت مند عزمیکہ ہر لحاظ سے بہترین نوجوانوں نے اس سے محبت کا دم بہرا اور خصوصاً وہ نوجوان۔۔۔۔۔ جس کے جذبہ میں اس قدر آئینہ تھی کہ اس کی گہمی نے اس کے دل کی سخی کو بھی پھل دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی محبت سچی ہے

اس کی قربانیوں نے اسے اپنا گردیدہ بنا لیا تھا۔ اور وہ اس نوجوان کی محبت کا
 اس قدر احترام کرنے لگ گئی تھی کہ اُسے یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بھی
 اس سے محبت کرنے لگ گئی ہے۔ اور پھر وہ وقت آیا جب
 شاعر خاوریہ ناباں کی مانند اس کی اندھیرے سے گھری ہوئی زندگی میں
 طلوع ہوا۔ اور اُسے پہلی بار محسوس ہوا کہ محبت کسی
 جوانی جذبہ کا نام نہیں۔ محبت زبردستی کرائی نہیں جاسکتی۔ بلکہ خود بخود
 انجانے میں ہو جاتی ہے۔ اور اس میں کسی جوانی تعاون کو دخل نہیں ...
 آہ۔ ایک نوجوان اس پر جان چھڑکتا ہے۔ اور وہ اس سے
 محبت نہیں کر سکی۔ اور تقدیر نے کس بے دردی سے اُسے ایک نوجوان
 کے لئے منے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا جو کسی اور سے محبت کرتا ہے ...
 وہ ایک بار پھر منشی۔ اُسے اُس بد قسمت نوجوان کی درد
 ناک حالت کا صبح اندازہ آج ہی ہوا۔ جس کی محبت کا جواب وہ نہ دے
 سکی تھی۔ گویا قدرت نے اسی بات کا انتقام اس سے لیا تھا۔ اُسے اس
 نوجوان کی حالت پر رحم آگیا۔ لیکن محبت اس کا رُخ
 کوشش کرنے پر بھی وہ اس نوجوان کی جانب نہ پھیر سکی۔ گویا اس کی
 محبت ایک چڑھی ہوئی ندی تھی۔ جس کا رُخ ایک بار جس جانب پھیر گیا
 پس پھر گیا۔ خواہ وہ علاقہ ریگستان ہی کیوں نہ ہو جس میں ہر ٹپک ٹپک
 ختم ہونے کے سوا اُسے کچھ حاصل نہ ہو سکا تھا۔ ناظر کی بات سن کر وہ
 اس سے محبت کرنا نہ چھوڑ سکی۔

رہ سکا۔ اس نے وہی جواب دیا۔ جس کی توقع تھی کہ ”یہ گناہ کیوں خواہ
مخواہ اپنے سر چڑھاتے ہو؟“ جیسے شاعر کے سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ وہ یہی
چاہتا تھا کہ وہ انکار کر دے۔ گویا شیطان کے سامنے اُسکے شکست خوردہ
ضمیر کو اصغری کے انکار نے ایسی مردہ پنچائی کہ اس نے شیطان کو بھگا دیا
لیکن شکست کھا لینے کے بعد بھی فتح پالینا شیطان ہی کا کام ہے۔ بھاگتے بھاگتے
وہ نہ جانے اس کے کان میں کیا پھونک گیا۔ کہ جیتا ہوا ضمیر پھر شکست کھا گیا
اور شاعر نے دلائل کا سہارا لیتے ہوئے کہا: گناہ ————— محبت میں
کوئی شے گناہ نہیں۔ اور پھر محبت کا مجازی معراج بھی تو یہی ہے۔ —————“
شاعر کہنے کو تو یہ کہہ گیا۔ لیکن اس کے دل کی تحقیقی آرزو یہی تھی کہ اصغری قطعاً
انکار کر دے۔ لیکن ————— اصغری نے سر جھکا دیا۔ گویا ایک خاموش
زبان نے ”ہاں“ کہہ دیا۔ شاعر کے جذبات کی راکھ سے دہنی ہوئی چپکالوں
کو کسی نے اس زور سے پھونک دی کہ شعلے بھڑک اٹھے۔ اس کا ضمیر
شکست فاش کھا گیا۔ اور اصغری سر جھکاٹے سوچ رہی تھی ”محبت کا معراج
..... تو کیا اس کے دل میں بھی محبت جاگ اٹھی ہے۔ یقیناً ایسا ہی
ہوا ہے۔ میری محبت نے آخر اسے مجبور ہی کر دیا۔ چنانچہ محبت کے اس تازہ
جوڑ کو چونا گچ کرنے کا یہ سنہری موقعہ.....“ اصغری یہ سوچتی ہی رہ گئی
اور شاعر.....!! باہر چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ قریب ایک منوہر پر
پرندوں کا ایک جوڑا پتہ پتہ پھر پھر اکہ ایک دوسرے کے ساتھ سٹ گیا۔

ات کا پچھلا پہر تھا۔ اصغری اپنے او سچا رہنے والے سر کو اس طرح جھکا بیٹھی تھی۔ گو یادہ اُسے اپنے شانوں کے اندر بیہوش کر دینا چاہتی تھی۔ کے چہرہ شکست و شرمندگی کا احساس لالی کی صورت میں نمایاں تھا۔ اس کی پسلی آنکھوں میں ایک میٹھی سی چمک اس کا میا بی کی نظر تھی جو شرمندگی کی قیمت پر حاصل کی گئی تھی۔ اس کی عرق آلود پیشانی دو منہ جذبات کی کش مکش کا منظر پیش کر رہی تھی۔

شاعر کی حالت اس شریف انسان کی مانند تھی جو کسی وقتی جوش مغلوب ہو کر ایک قتل کر بیٹھا ہو۔ لیکن جب وہ جوش ٹھنڈا ہو جاتا ہے! اپنے سامنے ایک چھپٹاتی ہوئی لاش دیکھتا ہے۔ تو اس منظر کی تاب سر سے پاؤں تک تھرتھرا جاتا ہے۔ اس مرنے والے کی بے بسی پر اس کے آ نہیں رکتے۔ اور قاتل کے لئے اس کے دل سے ایک بد دعا نکلتی شیطان اپنی کامیابی پر ہنستا ہوا چلا جاتا ہے۔ اور اس کا شکستہ ضمیر پھر جاگ اٹھتا ہے۔

شاعر ایک گناہگار کی مانند اس لڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ جس کا کچھ اُس نے چھین لیا تھا۔ اُسے محسوس ہو چکا تھا۔ کہ جس روز اس نے تباہی شکست کھا یا ہوا سمجھا تھا۔ اُس روز حقیقت اس کی فتح ہوئی تھی آج جبکہ اس نے اپنی دانست میں فتح حاصل کر لی تھی۔ اس کی دانسی کا دن تھا۔ اس کے تھرتھرتے لبوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی۔ اور ایک صراخ یا خدا مجھے معاف کرنا! اگر قریبی میز کا سہارا نہ ہوتا۔ تو وہ فرش پر گر پڑتا۔

دیر بعد وہ پھر مبھلا۔ اور اصغری کے قریب آیا۔ دونوں پھر ٹھٹھاتے ہاتھوں سے اسکا منہ تات چہرہ تمام کراہ پر کواٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن اصغری نے ہاتھ سے اُسے پرے دھکیل دیا۔ شاعر کے ہاتھ جھپٹ کر بے جان بازوؤں کے سہارے نیچے کو ایک گئے۔ لیکن اصغری نے گرتے ہوئے ہاتھ تمام لئے ایک ساعت انہیں پکڑے رکھا۔ سانپ کی برقی نگاہوں سے مسحور ہو گیا پرندہ اڑنے کی کوشش کے باوجود جب اس کے قریب تر ہوتا چلا جاتا ہے اسوقت اس کی نگاہوں سے جو بے بسی ٹپکتی ہے۔ اُسی بے بسی سے لدی ہوئی نگاہیں اٹھا کر اُس نے ایک بار شاعر کے چہرے پر نظر دوڑائی۔ اور دوسرے ہی لمحہ میں اس نے اپنے پھر پکتے ہوئے لب اس کے ہاتھوں پر رکھ دیئے۔ اور اُن دونوں ہاتھوں کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اپنی تمام طاقت لگا کر اس نے اپنی زبان کا قفل کھولا۔ لیکن محض اتنا ہی کہہ پا ئی۔ ”اب میرا تمہارے سوا اور کچھ نہیں رہ گیا۔ یہ بات بھول نہ جانا“..... اس بات نے شاعر کو سُن کر دبا۔ چند لمحے تو وہ اس طرح ساکت و عاصت رہا۔ گویا ایک لمبے جان بُت کیڑا کر دیا گیا ہو۔ جب اس کے حواس پھر برقرار ہوئے۔ تو اس نے دیکھا کہ ابھی تک اس کے دونوں ہاتھ کسی کے سینے سے لگے ہوئے ہیں۔ جس کی تیز دھڑکن بجلی کی رو کی طرح اس کی انگلیوں کے پوروں سے گزرتی ہوئی اسکے سر سے پیر تک پہنچ رہی تھی۔ وہ ایک ٹھوکر کھانے والے شخص کی مانند لٹکھڑا ہوا۔ اور گھٹنوں کے بل آ رہا۔ لیکن اصغری نے اس کے ہاتھ اپنے سینے سے نہیں ہٹائے۔

میں نے گناہ کیا ہے۔ اصغری۔ یہ میرے لئے اچھا نہ تھا۔ ایک فاشعہ سے میں نے بے فانی کی ہے۔ میں تمہارا بھی گناہگار ہوں۔ تم مجھے معاف کر دو۔ میں اس کا کفارہ ادا کروں گا۔ ”اصغری کے لبوں پر ایک ہلکا سا تبسم رکھا تھا۔ گواہ اسکے چہرہ پر شرمندگی کے آثار موجود تھے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اس کے ہاتھوں کو اپنے سینے سے جدا نہیں کیا۔ گویا اس نے اپنا سب کچھ دے کر جن ہاتھوں کا سہارا پایا تھا۔ انہیں اب وہ ہمیشہ کے لئے اپنے سینہ سے چمٹائے رکھنا چاہتی تھی۔ شرمندگی کے سمندر میں ڈوبتے ڈوبتے اس نے شاعر کی پشیمانی کو وہ تنکا سمجھا۔ جس نے اس کو سہارا دیا۔ لیکن شاعر کہہ رہا تھا: مجھے اس وقت جانے دو۔ اصغری پشیمانی نے میری روح کو بے چین کر رکھا ہے؟ شاعر نے ہاتھ جھپٹائے اور درختوں کے قریبی کنج کی اندھیری میں گھو گیا۔ اصغری کی مسکراہٹ معدوم ہو چکی تھی۔ سامنے چاند پھیکا پھیکا نظر آ رہا تھا اور سنائے تو گویا آنکھ میچ میچ کر اصغری کے متعلق چند راز و راز سرگوشیاں کر رہے تھے۔

اصغری نے اس کنج کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھتے دیکھتے کئی راتیں بتا دیں۔ جس میں شاعر غائب ہو گیا تھا۔ لیکن جانے والا لوٹ کر نہ آیا۔ چاند نے اسکی راہ میں چودہ راتوں تک روشنی کی۔ اور آخر انتظار سے تھک کر وہ بھی کہیں چلا گیا۔ لیکن اصغری انتظار سے نہ تھکی۔ اس کا انتظار آنسوؤں کے سوا کوئی پھل نہ لاسکا۔ آخر کار ایک رات جب اندھیرے میں دیوار کے لمبے ترے لگے

مجھے چھوڑ دو..... "اصغری اس سے پرے ہٹ گئی۔ شاعر نے قصوٰء کی آنکھوں سے اس چہرہ کی گہرائی ناپی۔ جو اس نے اصغری کے دل پر لگایا وہ اس پر بچا ہوا رکھے بغیر نہ رہ سکا۔ اُسے اپنی تحقیقی کیفیت کھولنی ہی پڑی۔ "شاید تم نہیں جانتیں۔ کہ میری باتیں خود میرے لئے کس قدر پر عذاب ہیں۔ لیکن..... وہ گناہ..... اسی کا کفارہ ادا کرنے کے لئے میں نے اپنے لئے یہ سزا تجویز کی ہے۔ تم یقین جانو۔ کہ تمہیں دیکھے بغیر میں پچھلی چودہ راتوں میں سو نہیں سکا۔ لیکن یہ عذاب مجھے برداشت کرنا ہی ہو گا۔ اس وقت تک۔ جب تک وہ..... جس کا میں نے گناہ کیا ہے مجھے معاف نہیں کر دیتی..... اگر تمہیں میری بات پر اعتبار ہو۔ تو یقین رکھو۔ کہ وہ کبھی ناراض نہیں ہو گی۔ میں اُسے بخوبی جانتا ہوں وہ تمہیں اس ملاپ پر مبارک کہے گی۔ میں جانتا ہوں۔ "میری رانی" ایسی نہیں ہے۔ "شاعر نے محسوس کیا۔ کہ جوں جوں وہ اپنی "رانی" کے جذبہ بخشش کا خیال کر رہا ہے۔ اس کی وہی کمزوری جاگ رہی ہے جس نے اُسے ایک بار گتھے میں گرا یا ہے۔ وہ پھر سنبھل گیا۔ اور اصغری سے اُسی پہلے ہجر میں کہنے لگا۔ "مجھ پر رحم کھاؤ۔ مجھے اس وقت چھوڑ دو۔" اصغری چپ چاپ واپس چلی گئی۔ وہ کیا کچھ نہیں کہنے آئی تھی۔ لیکن ایک لفظ تک اُس کی زبان سے نہ نکلا۔ البتہ جاتے ہوئے بار بار اس کی زبان پر یہ مصرعہ آیا۔

ہائے اس زویشیاں کا پیشیاں ہونا

شاعر کے کمرہ میں بہنے والے دونوں سائھیوں کا جھگڑا مٹ چکا تھا۔
 فیض احمد نے ٹھکانے مان لیا تھا۔ کہ اس غریب یقیناً ایک سیاہ کار لڑکی ہے۔ اس وقت
 شاعر پر لے کونے میں بیٹھا۔ نفس کے ہاتھوں انسانی شکست کی ترجمانی
 کے موضوع پر کسی فرانسیسی فلسفی کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔

ٹنگرگ۔ ستمبر ۱۹۲۱ء

موت کے بستے

رتبہِ دق کے ایک مریض کی ڈائری،

دیریری بیماری کے دنوں میں یہ ڈائری مختلف ادبی رسائل میں
بالاقساط شائع ہوتی رہی۔ اُن دنوں میں نے ذاتی طور پر جو
حواشی دیئے تھے۔ انہیں بعینہٗ رہنمائی دیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ بھی
اُس بابو سانہ ذہنیت کو بہت حد تک اجاگر کرتے ہیں جس کا
مطالعہ کرنے کی کوشش اس میں کی گئی ہے۔ (س)

یہ ڈائری محض شاعر کا تجلّی نہیں، بلکہ نفسیات کی حقیقت کا
مطالعہ ہے۔ ادبی ذوق رکھنے والوں کے سامنے کچھ پیش کر سکیں
یہ یارا مجھڑ محمدان کو نہیں، البتہ انسانی نفسیات کے طالب علم

کو اس میں بہت کچھ ملے گا۔ یہ اس شخص کے جذبات کا مرقع ہے جو موت کی دواؤں میں قدم رکھ چکا ہے۔ اور کسی بھی وقت قضا کی کہان سے کسی جان لیوا تیر کے نکلنے کا منتظر ہے۔ انسانی بنیاد کو کس قدر کھوکھلی ہے۔

کیا بھروسہ ہے زندگی کا

آدمی بلبلا ہے پانی کا

اور پھر جب اس کو کھوکھلی بنیاد کو بھی گھٹن لگ جائے تب اس کی حقیقت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ یہ وہ جانتا ہے اس میں کسی جذباتی غلط تصور پریش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یا اس ہمارے ہاں مزاج یا تخیل سے رنگ دیا گیا ہے۔ کیونکہ عموماً۔

لگا بھی دیتے ہیں کچھ زیب و اسٹاں کیلئے

چند ایسے قابل ذکر واقعات بھی ہیں جن کا ڈاٹری میں کھلم کھلا اعتراف ناگوار ہے۔ اگر اس ملک المرض نے جلد ہی کو بیج کا نقارہ نہ بجا دیا تو غالباً انہیں افسانوں کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرونگا۔ بہر حال اس زندانِ نشاہی میں پڑے پڑے ڈاٹری کے اوراق تو پڑھنا ہی ہونگا۔

راما نند ساگر

(۲ جون ۱۹۴۱ء)

یکم مئی ۱۹۴۱ء

جب میرے چلا کر میں ایک تپدیق کا مریض ہوں۔ ایک عجیب کیفیت طاری ہے۔ ماضی اپنے دامن میں میری تشنہ تکمیل آرزو میں لئے نہایت بیداری سے مسکرا رہا ہے۔ ایسا معلوم دیتا ہے جیسے کسی انجان کسان نے اپنی تمام محنت ایک ایسے میدان کو سیراب کرنے میں صرف کر دی ہو۔ جس میں حسرت کے پودوں کے سوا کچھ نہیں اُگتا۔

مستقبل کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں تو اس موذی اور ہلاک کئے بغیر نہ چھوڑنے والے مرض کے متعلق میں نے آج تک جو کچھ پڑھا یا سنا وہ سارا علم خیالات پریشان کی صورت میں مستقبل کو تاریک کئے ہوئے ہے۔ یاس کی گھٹائیں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن واہ مری امید۔۔۔۔۔ اس نے ابھی تک ایک ننھا سا چراغ دہاں جلا رکھا ہے۔ لیکن کبلا چراغ رات کی تاریکی کو زیادہ خوفناک بنا دیتا ہے۔ اس طرح بچنے کی یہ امید مستقبل کو زیادہ پریشان کن بنا رہی ہے۔ اگر تپدیق کا مریض وقتی طور پر بچ بھی ہے تو کیا، عمر بھر کے لئے داغدار ہو جاتا ہے۔ یوں کہو کہ قدرت نے ایک تیرنیم کش ”چھوڑا ہے جس کی غلش اب تا حیات نہ جاسکے گی۔ ایک عجیب کیفیت ہے، گو یا میرا مہدی حیات زندگی اور موت کے چکروں میں کھلے رہا ہے۔

آج ہمارے کالج کے وائس پرنسپل جناب احمد غریب نواز نے میرے غریب خاں کو بھی نوازا، بہت کچھ دلا سادیا جس سے گرتی ہوئی امید پھر سنبھل گئی بہر حال دنیا برامید قائم است

۴ مئی

یکم مئی کو لاہور سے چلکر آج رات سر پچر پہنچا۔ لاہور سے روانگی کا نظارہ تصور میں آنے ہی آنسو ڈبڑا آنے ہیں۔ دوستوں کا جھوم اور پھر اس مجمع پر یہ خیال غالب کہ ”مبادیہ ہماری آخری ملاقات ہوں“ اس جذبہ کی موجودگی میں یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس طرح سائے کا سایہ مجمع مجھے آنسوؤں سے لدا ہوا ایک بادل دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دوستوں کا منہ پھیر کر آنسو پونچھ لینا اور پھر میری طرف ہنستے ہوئے دیکھنا وہ اپنی دانست میں مجھے بنا رہے تھے لیکن درحقیقت میں انہیں بنا رہا تھا۔ میں انکی ہنسی کے پس پردہ چھپا چھپم ہر ہنسنے آنسو دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی کھل کر بات نہ کرنے پاتا تھا۔ اور میں جانتا تھا کہ انکے گلے آنسوؤں سے مہر آئے ہیں۔ اس منہ سنجاری کا خیال بھی مجھے جس قدر پریشان نہ کر سکا اس سے زیادہ تکلیف مجھے اس وقت خیر نظر نہ پہنچائی۔

اس وقت جب کہ موت کو میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے بایا تو میری آنکھوں پر سے ایک پردہ سا اٹھ گیا میں نے دوستوں کی حقیقت پالی مجھ پر اس راز کا انکشاف ہو گیا کہ مرتے وقت انسان کے لئے اگر کوئی خیال راحت کا باعث ہوتا ہے تو وہ یہی کہ کسی سچے دوست کی دوستی آخر تک اسکے شامل حال رہی۔ اور یہ امید کہ ”میرے بعد بھی اس کی دوستی مجھے دغا نہ دے گی“ اس حقیقت کا انکشاف مجھ پر ہوا بھی تو کس وقت۔ پھر

بعد مرنے کو کوئی بالائے بام آیا تو کیا

۵۔ مٹی:

کشمیر کا موسم خوب تر تھا کہ کی دھوپ پڑ رہی ہوتی ہے کہ ناگہا
آسمان کے دماغے پر چوٹ پڑتی ہے۔ باہر جھانک کر دیکھتے ہیں تو چاروں طرف
سے گھنے بادل سو۔ ج پر یلغا کرنے نظر آتے ہیں۔ یجبہ میرے دل کی کیف
ہے۔ بچوں سے کھیل رہا ہوتا ہوں کہ اچانک انکے مستقبل کا خیال آتے
دل مغموم ہو جاتا ہے۔

۶۔ مٹی:

میرے عزیز ترین دوست طاہر کی چھٹی آئی ہے، اسکے جذباتی
نے کچھ اس طرح دل کے تاروں کو چھیڑا ہے۔ کہ ایک پرسوز نغمہ گونج
ہے۔ اور ایک رفاہ کے از خود تھکر اٹھنے والے پاؤں کی مانند وہ
آئسوہمی آنکھوں کے پردوں میں تھرکنے لگے ہیں۔ ایک شوخ اور
سدا بادل دھوپ میں نہا رہا تھا۔ کہ اس نظر سے کی تاب نہ لا کر وہ
بھی رو دیا۔

۷۔ مٹی:

طبیعت میں قدرے شگفتگی ہے۔ تپدق بھی ایک شاہی مرض ہے
جھلے محنت مزدوری کرتے انسان پر جب ڈاکٹر یہ فتوے صادر کر دیں کہ
تپدق ہو گیا ہے تو سمجھ لو اسکے نصیب کھل گئے۔ جیسے ایک چھوٹی موٹی ریا
مل گئی ہو، اسے ایک قدم تک چلنے کی ضرورت نہیں رہتی، بیٹھے بٹھائے ہر
کا آرام وہیں میسر آ جاتا ہے۔ بہتر سے بہتر کھانا ملتا ہے۔ پینے کو اچھا اور

ایک پر حکمرانی۔ وہ حقیقت تمام شاعروں کو اس شاعرانہ مرض میں مبتلا ہو جانا چاہیے۔ انہیں وہ نیکے تفکرات سے جس قدر بے نیازی کی ضرورت ہے، وہ حضورؐ۔ "تہدیق" والا شانہ ہی کا دامن تھامنے سے بیسرا سکتی ہے۔

۱۰ مٹی :-

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مرض میں محض مرے ہی مرے نہیں بلکہ ان پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہیں۔ یعنی بیوی سے جبری جدائی۔ آپ لاکھ کہتے کہ صاحب ہمیں بیوی سے محبت ہی نہیں بلکہ عشق ہے، ہم اُسے دیکھے بغیر زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ لیکن وہاں سنا ہی کون ہے۔ تہدیق کیا لگ جاتا ہے گو بالام لگ جاتی ہے۔ اور بیوی کی وقعت غیر ملکی ڈاک کی چٹھی سے کچھ زیادہ نہیں ہوتی کہیں کسی طرح سسرال کے غیر مالک سے آ بھی جائے تو ہمارے بعد جانی میں پہنچتے ہی سنسر کی نذر ہو جاتی ہے۔ لگ کہیں براہ کرم ہم تک پہنچائی بھی جائے تو حسب طرح سنسر شدہ خط کی بعض سطور کو مٹا دیا جاتا ہے اس طرح اسکی ملاقات پر پابندیاں لگ جاتی ہیں کہ زیادہ بات چیت نہیں کر سکتے۔ ایک دوسرے کے قریب سٹ کر نہیں بیٹھ سکتے، انتہائی میں نہیں بیٹھ سکتے۔ ایک دوسرے سے اپنا راز دل نہیں کہہ سکتے۔ غرضیکہ کونسی پابندی ہے جو نہیں لگائی جاتی۔ گھر والوں کو مرض کا جسم پیارا ہوتا ہے۔ اس کے جذبات نہیں۔ کون ہے جو مر لیں کی زبان سے انہیں نظیری کا یہ شعر پڑھ کر سنائے :-

ترک شراب و شاید ہم بیمار کردست از طبیب
صحت بخوام یا فتن تا نشکنم چوب زرا

۱۲ مئی

ان مزاج پر سی کے لئے آنے والوں سے خدا پیٹے یہ خصوصاً جب وہ کوئی عورت ہو۔ مریض کی طبیعت اچھی بھلی بھلی ہوتی ہے کہ ان کی بے موقع ہمدردی نئے سرے سے اسکو پریشان کر دیتی ہے کس کس انداز سے اور کتنی کتنی کوششوں سے آنکھوں میں آنسو بھر لاتی ہیں۔ بھرائی ہوئی آواز میں باتیں بیا کرتی ہیں کہ مریض کے زخموں پر چمکے لگاتی ہیں۔ ان ننھے ننھے بچوں کا خیال آ رہا ہے انکا تمہارے سوا ہے کون۔ دیکھو نہ ابھی سے اٹکے چہرے اتر گئے ہیں اس ننھے کو تو دیکھو کس طرح حسرت بھری نگاہوں سے تمہاری طرف دیکھ رہا ہے۔ تمہاری بیوی کہاں ہے؟ اس بیچاری کو دیکھو اس پر تو گویا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ یہی سی جان ابھی اسکے کھیلنے کے دن تھے..... ”غرضیکہ سنتے سنتے آپ کو اپنا زندہ ہونا بھی مشکوک دکھائی دینے لگے گا۔ مجھے جب کسی ایسے بیمار وار کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو میں دیوار کی جانب منہ پھیر لیتا ہوں۔ دیوار پر میں نے جوش کا یہ شعر لکھ رکھا ہے۔ اسی کو پڑھ کر دل کو تسلی دے لیتا ہوں۔ ع

کیا نزع کی تکلیفوں میں مزاج مت نہ آئے جوانی ہیں
کیا لطف جنازہ اٹھنے کا ہر کام یہ جب ماتم نہ ہوا

۱۴ مئی

آج تمام دن کچھ ایسے واقعات یکے بعد دیگرے رونما ہوئے کہ بار بار مجھے کہنا پڑتا تھا۔ ع

”اتفاقات ہیں زمانہ کے“

میں لالہ لاجپت رائے کے خود نوشت حالاتِ جلا وطنی، پڑھ رہا تھا نہیں کل صبح ہی ختم کیا۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ چند ہی گھنٹے بعد مجھے بھی بعینہ انہی حالات میں قطعاً غیر متوقع طور پر گھر سے جلا وطنی کے ناگہانی احکام سننے ہوئے ڈاکٹروں نے مجھے فوراً سرکاری سینے ٹوریم میں لے جانے کا حکم سنایا۔ اس ناگہانی ابتلا نے مجھ پر جو اثر کیا وہ قلمبند نہیں کیا جاسکتا۔ میں رات بھر سو نہ سکا کسی کی جدائی کے خیال نے لیٹر پر کاتے بچھا رکھے تھے، آج بہت سویرے سبنی ٹوریم کی طرف روانہ ہوئے، یہ سبنی ٹوریم وادی کشمیر سے اڑھائی ہزار فٹ کی بلندی پر ایک پہاڑ کے پہلو میں چیل کے گھنے جنگلوں کے درمیان واقع ہے۔ موٹر جوں جوں بلندی پر جا رہی تھی نیچے وادی کشمیر کا منظر کھلتا جا رہا تھا۔ میری نگاہیں بار بار اس انشی میسر لمبی وادی میں دوڑ کہیں کسی اپنے کو ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

آخر کار سینے ٹوریم میں پہنچے، یہاں ایک اور دلچسپ اتفاق پیش آیا۔ سبنی ٹوریم متعدد دھوپ جھونپڑیوں پر مشتمل ہے جو ٹاپوؤں کی طرح اوجھڑاؤ بکھری ہوئی ہیں۔ ایک کمرہ میں دو مریضوں کے لیٹر ہوتے ہیں جو نہی ہیں اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ عین اسی وقت ایک اور مریض کو بھی اسی کمرے میں عکودای گئی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو خود بخود تسلیم کے لئے جھک گئے۔ میرا سانس بھی کوئی نیا نہ تھا۔ آج سے آٹھ سال قبل ہم دونوں ایک ہی کالج میں ایف۔ اے کی جماعت میں اکٹھے تھے۔ آٹھ سال سے ایک دوسرے کا کچھ پتہ نہ تھا۔ آخر قدرت نے ہمیں ملایا۔ لیکن کہاں! اور کس صورت میں؟ اس پر لطف

عشاق کی طرف نگاہ بھر کر دیکھنے کی جیسے اُسے فرصت ہی نہیں، یہ جگہ بادلوں کا گویا سیر گاہ ہے۔ شاید کہیں پاس ہی میخانہ ہے کہ جو بادل آتا ہے جھومنا ہوا مستی کے مارے اس کا پاؤں ہی زمین پر نہیں لگتا۔ ننھے ننھے بادل ادھر ادھر جھاگ رہے ہیں۔ کوئی کوئی تو اپنی شہادت کی سزا پا کر پہاڑ سے ٹھوکر کھا کر گر بھی پڑتا ہے۔

سوچ اس "معشوق پس پر وہ" کی مانند ہے کہ جس کی بازیب کی جھنجکاہ سے ہی اس کا وجود قبول کرنا پڑتا ہے۔ اور تصور ہی تصور میں اس کے نظارہ سوز جلوہ سے دل کو تسکین دی جاتی ہے یعنی کبھی کبھی ان شہابی بادلوں کی نظر چھپا کر کوئی سنبھری لباس والی نازک اندام کہ ان یہاں کے سبزے پر ایک بار لوٹ جانے کے لئے بھاگ آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کہیں سوچ بھی ہے۔ سامنے گلرگ کی چوٹی اور اس کے عین اوپر کھلن مرگ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹی اپنی رعنائی پر نازاں غور سے سرائٹھلے کھڑی ہے۔

بیچوٹی کیا ہے ایک بت ہر جاتی ہے کہ اپنا سفید برفانی چہرہ کھولے کچھ اس انداز سے کھڑی ہے کہ ہر راغب بادل اس سے بغلیگر ہو جاتا ہے۔ انہیں جبینوں کی مکاری بھی کوٹ کوٹ کہ بھری ہوئی ہے۔ اپنا وسیع وامن پھیلا رکھا ہے اور ہر لپٹنے والے کی گرہ کھول کہ کچھ اس طرح فقرتی برف کے تودوں کے تودے نکال لیتی ہے کہ اُسے کانوں کان خبر نہیں ہوتی اور وہ اپنے نقصان سے بے خبر اپنی کامیابی پر اترتا ہوا اپنی راہ چلا جاتا ہے۔ کئی ننھے بادل تو اس عیارہ پر کچھ اس طرح فدا ہوتے ہیں کہ اپنا سب کچھ اسی

کے حوالے کر جاتے ہیں۔ لیکن کئی ایسے بھی رہند ہیں جو دُور ہی دُور سے ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹھوڑی اور گالوں کی چٹکیاں لے لیتے ہیں۔ اور ہنستے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

آسمان کی جانب سے نکالہ سٹپتی ہے تو نیچے بہت دور ہٹتا ہوا دیریا ہے جس کی بل کھاتی ہوئی سفیدی اس قدر اونچائی سے ایک عجب بہار دکھا رہی ہے، غرضیکہ ایک ایسا نظارہ موجود ہے جس کو بیان کرنے کا کم از کم مبرے تسلیم کو تو یارا نہیں۔ البتہ شاعر کے قلم پر بھرے کر کے اسی کے چند اشعار میں اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ حفیظ

برف کی اونچائیاں برفاب کی گہرائیاں
زنگ بوکی شوحیاں بھونکی بے پرائیاں
سبز قالینوں پر دیواروں کی بزم آرائیاں
نئے نئے چلتے پھرتے ابر کی پرچھائیاں
آگے پیچھے دوڑنا تاہر کی دستور کا

نڈیاں برسوتھرتی ناچتی گاتی ہوئیں
کسمپاتی، لٹکھڑتی پیچ بل کھاتی ہوئیں
آدمی کیا پتھروں کو جذب میں لاتی ہوئیں
اپنی اپنی منزل مقصود کو جاتی ہوئیں
کدتی جاتی ہیں نگاہوں پر عمل تسخیر کا

عالمیوں نے کہہ دیا کشمیر کو جنت نشاں
ورنہ جنت میں یہ حسن و رنگ نشاں کی کہاں
کیا ہے جنت چند حوریں اک چین و نہایاں
خیر زامہ کی رعایت سے یہ کہتا ہوں کہ ہاں
عالم بالا یہ ہے پر تو اسی کشمیر کا

۱۸ مئی:

اس جگہ قدرت نے جس قدر فیاضی سے کام لیا ہے۔ کاش مقامی حکمران
اس سے آدھی فیاضی سے کام لیتی، لیکن وہ تو شاید قدرت کی لامحدود سخاوت
کا پلہ برابر کرنے کے لئے مریضوں کی دیگر ضروریات کے بارے میں بخل سے
کام لینے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ یہاں تک کہ اس سال گزشتہ سالوں کے
مقابلہ پر نصف خوراک دی جاتی ہے۔ حکام کا یہ خیال شاید کچھ بجا بھی نہیں
کہ قدرت کے مسحور کن نظاروں سے جی بھر کر سیر ہو جانے کے بعد کھانے کی
گنجائش ہی کہاں رہتی ہے۔

اور تو اور یہاں کوئی خوبصورت نرس تک نہیں۔ مجھے یاد آتا ہے جب
کبھی خوش قسمتی سے ہمارا کوئی دوست یا رشتہ دار بیمار ہو کر میوہ ہسپتال
میں داخل ہوتا تھا تو اسے رشک حور نرسوں کے ہاتھوں دوائی پیتے یا
ان کے بازو کا سہارا لے کر اٹھتے بیٹھتے دیکھ رشک کے لئے اپنے
آپ پر غصہ آتا تھا کہ کجنت ہمیں تو کوئی بیماری بھی نہیں لپٹی اب دیکھئے
کہ ”بیماریوں کی ستراج“ مول لیکچر شاہی مریض ”بھی بنے ہیں۔ لیکن اس

قدرت ربانی کرنے پر بھی ہمیں کوئی خوش مثال نرس نہ مل سکی۔ خیر لوں نہ ہی
نصو رہیں ہی سہی۔

۵ اے دل ملی ہے اس قدر فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہو تصورِ رحباناں کٹے ہوئے

۲۰ مئی:

کچ میرے ہنسیوں کا والد سات روز کے بعد پہلی مرتبہ اُسے ملنے آیا۔
اپنے بیٹے کے تئیں اس کی روکھائی دیکھ کر میرے دل کو بہت عدمہ پہنچا۔
اس کی باتیں کسی دشمن سے بھی زیادہ کڑوی تھیں۔ آج مجھے اس مقولہ
پر یقین آگیا۔ کہ سوتیلی ماں کے آنے پر باپ بھی سوتیلا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ
میرے سامنے چند زندہ مثالیں اس مقولہ کے رد کے لئے موجود ہیں۔ لیکن
آج کے واقعہ نے میرے دل میں یہ شبہ پیدا کر دیا کہ کیا ان بتاؤں پر
بھی ہمیشہ کے لئے بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟ کیا ان پر کسی بھی وقت سوتیلی ماں
کا پیار غالب آجانا ناممکن ہے؟

۲۱ مئی:

آج میرے موقوف بچے بھاس
چند راور شانتی ساگر مجھے ملنے آئے تھے۔ وہ میری گود میں آنے کے لئے
کس قدر بے چین ہو رہے تھے۔ لیکن میں چاہتا ہوں ابھی ایسا نہ کر سکاؤں
رہا۔ کہ کہیں میرا پیار ان تھکی جانوں کو مہنگا نہ پڑے دیکھو نیکہ تپدی کے مرضی
کے قریب آنے والے کو اس موزی کا شکار ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے آخر کار
دونوں اپنی انگلیوں کو دبا کر اپنے پیار نہ کرنے والے باپ کو حیرانگی د

حسرت سے دیکھتے ہوئے چلے گئے۔ شاید یاس نے اس وقت کے لئے کہا تھا۔

کیا کہیں اڑ کے جا نہیں سکتے
وہ چمن ہے وہ آشیانہ ہے

۷

۲۲ مئی:

تبدیق کا مرض اور اس کا مریض دونوں کافی دلچسپ ہیں۔ یہاں سینے ٹوریم میں گٹھی بننے کے اچھے بھلے نوجوان ہیں۔ چہروں پر سرخیوں دوڑ رہی ہیں۔ لیکن یہ ظاہری نقاب الٹ کر دیکھئے تو تبدیق کے جراثیم ان کے پھیپھڑوں میں سوراخوں پر سوراخ کئے جا رہے ہیں۔ یہ مرض عموماً طول پکڑ جاتا ہے۔ اسی طوالت سے خوفزدہ ہو کر بارہا میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔ نشتر

میتا و نفس میں جینا کیا یا پھیپھڑی یا چھوٹے مجھے

ہے آرزوئے آرام مگر پابندی کا آرام نہیں

اس سے بھی زیادہ المناک نظارہ اُن کمسن بچوں کا ہے جو اس مرض الموت کے جنگل میں پھنسے ہوئے سینے ٹوریم کی چار پائیوں پر کھڑے ہیں اگلے روز کسی مریض نے احوال مخاطب کر کے ایک کشمیری گیت کے اس شعر میں کستورہ صبح احساسات کا اظہار کیا۔

”تو اس دنیا میں ناحق وارد ہوا۔ اضرماں کے لطن سے تیری پیالہ نش

میں کون سی مصلحت مضمر تھی“

۲۳ مئی:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی قدرت کو بھی بکس انسانوں کے ساتھ مذاق کرنے اور ان کے ساتھ کھیلنے میں لطف آتا ہے۔ میرے ساتھ قدرت کا کیا کم مذاق کیا۔ اسے چھوڑیے، یہاں جو کمسن مرلین ہیں۔ ان کے ساتھ یہ سلوک کر کے قدرت نے ان کی کمٹی نہیں اڑائی تو کیا کیا؟ آج اس طرح کا ایک واقعہ پتہ چلا۔ میرے ساتھ کی جھونپڑی میں ایک نوجوان رہتا ہے۔ اس کی ایک بچپن کی بھولن کے ساتھ شادی طے پائی اب اس میں ورنگ محض اس نوجوان کی ملازمت پکی ہو جانے کی تھی۔ آخر کار خدا خدا کر کے اس کی ملازمت پکی ہونے کے احکام آئے۔ گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ لیکن اس سے پیشتر کہ وہ خوش بخت پیدے ماہ کی تنخواہ لاتا بخارنے آدیا یا۔ اور اس پر ٹپ وق کا مرلین ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا گیا۔

قسمت پر اس مسافر بکس کی روٹی
جو خدائے عظیم گھبراہٹ کے سامنے

۲۴ مئی:

سینے ڈریم کی مغموم فضا میں کبھی کبھی چند مرلیوں کی بوجھیاں تفریح سامان بھی پیدا کر دیتی ہیں۔ اگلے روز ایک مرلین نے ڈاکٹر پر جھوٹا موٹ ثابت کرنے کے لئے کہ مجھے سخت بخار ہے مگر ماسٹر کو فعل میں لینے کے بجائے اپنی رضائی کے اندر رکھی ہوئی آگ کی کانٹھ کی ایک طرح کی ایٹمی ایپرکچر

دیر رکھ کر دکھا دیا۔ مقرر میٹر دیکھا تو ڈاکٹر سنہی کے ماسے لوٹ پوٹ ہو گیا
و تحقیقت پارہ ۱۱۰ ڈگری تک جا چکا تھا۔

بوالعجب ہنگامہا گرم است در بازارِ ما

۲۷ مئی:

آج کوئی مجھے چھوڑ کر یہاں سے چلا گیا۔ میرے تصور کی آنکھیں اُسے دور
بہت دور کہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ جب تک شام نے روشنی پہ تسلط
نہ جمایا میں اس گرمی سے اٹے ہوئے راستہ پر آنکھیں گاڑے بیٹھا
رہا جس پر اس کی موٹر گر داراقتی ہوئی چلی گئی تھی۔ بار بار یہ شعر زبان
پر آتا تھا: غالب

فروادو سے کاتفر قہ یکبار مسٹ گیا
کل تم گئے کہ مجھ پر قیامت گذر گئی

یکم جون:

یہ دنیا بھی ایک مجموعہ اخلاقی ہے آج سے دو روز پہلے جب کوئی مجھے چھوڑ
کر کہیں بہت دور چلا گیا اور جب میں اواس اور علیکین اپنی جھونپڑی کی جانب
لوٹ رہا تھا تو اچانک جنگل شہنائی کی آواز سے گونج اٹھا پڑوس کے گاؤں
میں کسی کی شادی تھی۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے مجھ سے کئے گئے سنگ
اس دردامیز مذاق کو دیکھ کر کوئی شیطانی روح خوشی کے ماسے ناچ
اٹھی ہو۔ اس کا وہ نغمہ کسی تیز خنجر کی مانند میرے دل میں اتر کر اُسے
خون خون کر گیا۔

اس حقیقت میں کتنی تلخی ہے کہ عین اس وقت جب ایک شخص اپنے محبوب کے بچھڑ جانے پر خون کے آنسو بہا رہا ہو۔ کوئی دوسرا اپنے محبوب سے ملنے کی خوشی میں شہنائیاں بھونک رہا ہوتا ہے۔

”اے خوشیاں منانے والو۔ خوشی کے موقعوں پر اس طرح جوش و خروش سے اظہارِ شادمانی چھوڑ دو۔ کیا جانے اس موقع پر کوئی مہجور تمہارے ان نعمت ہائے شادی کی تاب نہ لاکر تڑپ اٹھے۔“

بہر حال مشکل تمام اس دھنگارِ غم کی زد سے اپنے تئیں بچا تا ہوا اپنی جھوٹری میں صبح سلامت پہنچ گیا۔ لیکن غضبِ نوبہ ہے کہ اس جھوٹری نے بھی مجھے پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ میرا کمرہ جیسے مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ اودھروں ہے کہ ہاتھوں سے نکلا پڑتا ہے۔ اودھروں کاغذ پر لیشان کر رہا ہے۔ بار بار یہ خیال آتا ہے کہ ”کیا یہ ہماری آخری ملاقات تھی؟ کیا میرے ہمدردوں نے ایک سازش کر کے مجھے اور اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا ہے۔“ ”احسرا“ ان اپنوں کو کیا کہوں؟ شاید ان کا خیال ہے کہ مرلیض اس طرح اچھا ہو جائے گا۔ لیکن تپِ وق کا مرلیض اور اچھا ہو جائے؟ لغو باللہ۔

یہ صبح ہے۔ گزشتہ ایک ماہ میں میری صحت خوب ترقی کر گئی ہے محض چار ہفتوں میں میرا وزن آٹھ پونڈ بڑھ گیا ہے۔ لیکن اس سے کیا؟ اس خونخوار مرض کے ہتھکنڈوں سے کون واقف نہیں۔ دور کیوں جاؤں اسی سینے ٹوریم میں میری آنکھوں ویسے چند واقعات شاہد ہیں۔ کہ کتنی

مریض اچھی بھلی حالت میں آئے چند ایک ماہ تک خوب ترقی بھی کی لیکن اچانک کچھ ایسا پٹکا کھایا۔ کہ خون آنا شروع ہو گیا۔ اور خون بھی ایک ایک تے میں سیروں۔ اور قصہ مختصر یہ کہ آخر کار چار آدمیوں کے کندھوں پر اس سینے ٹوریم سے وداع ہوئے۔

ان مشاہدات کے پیش نظر کیا یہ معجز نہیں۔ کہ اپنوں نے ہمدردی کی آڑ میں مجھ سے وہ کچھ کیا جو شاید بیگانے بھی نہ کر سکتے۔ حافظہ :-
 من از بیگانگان ہرگز نہ نام
 کہ با من ہرچہ کہ داناں آشنا کرد

۴ رجول :-

چند ایسے واقعات مختلف ذرائع سے پتہ چلے ہیں جنکی حقیقت میرے اس عقیدہ کو مزید یکنگنی بخشتی ہے۔ کہ قدرت کو بھی کبھی کبھی بے بس انسانوں سے مذاق کرنے کی سوجھ بوجھ ہے۔ ان واقعات کے پردہ میں وہ حقیقت صغر ہے جو کسی تخیل کی صنعت سے کہیں زیادہ المناک ہے۔

ایک دیسی ریاست کے میڈیکل انسٹرکٹر واقع ہے کہ اسکا اکلوتا بیٹا کالہ میں وکالت کا امتحان دیکر چلا آیا۔ اچانک بیمار ہو جانے کے باعث وہ نتیجہ کا انتظار نہ کر سکا۔ گھر پہنچے پر پتہ چلا کہ آج بجناب علم و لیاقت کے ساتھ ساتھ ایک خطرناک قسم تپدق کا سرمایہ بھی لائے ہیں غرضیکہ وہ ہی چار ہفتوں کے بعد اُسے دنیا کے رنج و راحت سے ابدی سکون حاصل ہو گیا۔ بد نصیب باپ جسوقت اپنے گھر کے چراغ کو کسی ایک بیابان میں مردہ روحوں کی تخیل میں چھوڑ

کہ واپس گھر پہنچا۔ تو اس سونے گھر میں ایک بھری تار اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جس میں لکھا تھا۔

”آپ کا ہونہار لڑکا اول درجہ میں پاس ہوا“ باپ نے اس خبر کی خوشی میں آنسو لٹا دیئے۔

ایک دوسرا واقعہ اسی سینے ٹوریم کا سینے۔ ایک مریض آج چار سال سے یہاں کی آہنی چارپائی پر پڑا پچھڑ پچھڑا رہا ہے۔ ارکان قضا و قدر کو خوب اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ یہ شخص جو کچھ دن کے وقت خون پسینہ ایک کر کے کھاتا ہے اسی سے رات کو ایک بیوی اور دو بچوں کا پیٹ مشکل تمام بھر پاتا ہے لیکن انہیں اس سے کیا۔ کسی کی غربت سے بے نیاز سرمایہ دار کی طرح انہوں نے بھی اس کے بستے گھر کو اپنی کھلوڑ بنا لیا۔ بیوی اپنے میکے پناہ گزین ہوئی۔ لیکن نیلے منہ والے آسمان کو یہ کب گوارا تھا ننھے ننھے بچوں کو نہال سے بھی دھکا دے دیا گیا۔ اور اب وہ بیچارہ می خدا جانے کس طرح گزر رہا ہے۔

شاہد یہ داستان غم ابھی تک نقطہ خروج پر نہیں پہنچی تھی۔ اسی دوران میں وہ کبھی کبھی خاندان کی تیمارداری کے لئے یہاں بھی آتی رہی۔ جس کا انجام ایک بچہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جس روز یہ خوشخبری ہم نے سنی تو اس شخص کو مبارکباد دینے گئے۔ اس نے خون آلود موتی لٹا کر اس مبارکباد کو قبول کیا۔ اس واقعہ کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ اس ننھے معصوم کو پیدائش سے پہلے نپٹ

وراثت میں مل چکا ہے۔ چند اور واقعات بھی ہیں لیکن قدرت کی فیاضیاں
دکھانے کے لئے کیا یہ دو ناکافی ہیں۔ ۹

۶ جون :-

آج شام سیر سے لوٹے تو شام گہری ہو چکی تھی۔ کسی نے کہا کہ اس راستہ
سے نہ جاؤ۔ کیونکہ جھاڑیاں بہت ہیں۔ اور ان میں سانپ بکثرت موجود ہیں اور
تو اس پگڈنڈی سے منہ موڑا لیکن پھر خیال آیا کہ عجب انسان ہو۔ تپدی کے
ماسے ایڑیاں رگڑ رہے ہو۔ اور اس طرح کی خود ادا اور فوری موت منہ موڑنے
ہو۔ آخر اس طرح بد سول سبزی چھٹپٹانے سے کیا حاصل اور اگر کسی طرح بچ
بھی رہے۔ تو بھی پرہیز کی ایک تلوار تہا سے پاؤں تلے رکھ دی جائیگی۔
اس کی تیز دھار سے گھبرا کہ پاؤں پھسلا نہیں۔ کہ پھر اس خوفی دریا میں
غوطے کھا ڈنگے۔ اس سے کیا یہ موت بدرجہا بہتر نہیں؟ چنانچہ جی کہہ کر کے
اسی راہ پر ہو گئے۔ لیکن ایک مذوق شخص کی اتنی خوش قسمتی کہاں کہ اسے
سانپ ڈس لے۔

منحصر مرنے پر جو جس کی امید
نا امید می اس کی دلچسپا ہیئے

۱۴ جون :-

گزشتہ ہفتہ خوب رہا۔ آج چند رہ روز سے بخار نہیں ہوا اور طبیعت
بقول کے ”چھلانگیں لگا رہی ہے“ تاہم ایک غائے دل میں ضیاء امید کا نور بڑھتا
جا رہا ہے طبیعت میں شگفتگی پاتا ہوں۔ لیکن اچانک کڑک اٹھنے والی بجلی کی مانند

اس مرض کا خیال آتے ہی سر سے پاؤں تک لہذاٹھتا ہوں۔

میرے کمرہ میں کتوں کے دو ننھے ننھے پلے ہیں۔ سچ پوچھو۔ تو اس بہتائی میں یہ دونوں سب سے بڑھکر میرے مونس و مخوار ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن اس حقوق پرستی کے زمانہ میں وہ بھی اپنے حقوق پر ضرب برداشت نہیں کر سکتے۔ انہیں پتہ ہے کہ کھانا کھانے کے وقت مجھے حصہ بانٹنا انکا پیدہی حق ہے۔ چنانچہ اگر کسی روز تھاں میں انکا حصہ نہ چھوڑا جائے۔ تو ”پروٹسٹ“ کے طور پر کمرہ میں اودھم مچا دیتے ہیں۔ شام کا وقت ہو۔ تو آساورئی گانے لگ جاتے ہیں۔ صبح ہو تو ”شام کلیان“ انہیں بہتیرا سمجھاتا ہوں کہ ”میاں راگ ہی گانا ہے۔ تو وقت کے مطابق گاؤ۔ لیکن انکے تان پلٹوں میں میری آواز کون سنتا ہے۔ حتیٰ کہ مجبور ہو کر اپنے ”ریڈر و فنڈ“ سے انہیں ڈبل روٹی دینا ہی پڑتی ہے۔ جب کہیں یہ ستیہ لگ رہی مانتے ہیں۔

۱۶ رجول:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تپدی مجھے شاعر بنا کے چھوڑ گیا۔ یہ ایک ایسی المناک چوٹ ثابت ہوا ہے۔ جو ایک شریف انسان کو شاعر بنا دیتی ہے یا یہاں کی فضا ہی شعر تیز ہے۔ جس طرف بھی نکل جاؤ چستے۔ آبشاریں۔ اور قدرت کا وہ حسین کھڑا جو غارہ طرازی کا مہون نہیں۔ جنگل سے باہر نکلو۔ تو میلوں لمبی گھاٹیوں میں پھیکے ہوئے کھیتوں کی ہر لہر اور پھر ان میں کام کرنے والی وہ حسین اور نوجوان عورتیں جو بلاشبہ مصوٰف قدرت کی شاہکار مورتیں ہیں مادر اس پر طرہ یہ کہ انکے حسن پر حجاب کا ہلکا سا پردہ بھی نہیں ہوتا۔ وہ حسین جو اپنے

حسن کو نہیں پہچانتے آپ کو دیکھ کر بھی بے حجابانہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں
 ٹوٹی پھوٹی کشمیری زبان میں آپ کے سوالوں کا جواب جب ہنسکر دیا جائے تو کیوں
 نہ آپ شاعر بن جائیں۔ اور پھر جب آپ ان کے نہ سمجھنے والے گیتوں کا غم نہیں جو کسی
 حسین کے لبوں کو چھو آنے کی خوشی سے پاگل ہو کر چاروں طرف پہاڑوں سے
 ٹکڑا ٹکڑا کر آپ کو بھی پاگل بنا دے۔ تو آپ شاعر نہ بنیں۔ تو اور کیا ہو۔ غرضیکہ
 اس ماہ میں نے تین غزلیں کہہ ڈالیں۔ شاید یہ میرا پہلا موقعہ ہے کہ میں نے
 کوئی غزل مکمل کی ہو۔

خدا جانے مجھ پر دل کو کس نے کہہ دیا۔ کہ میں شاعر ہوں۔ ان میں نہ صرف
 چند شاعر نواز ہیں۔ بلکہ کچھ ایک شاعر بھی ہیں۔ یہی نوجوان شاعرات کو جب
 مشاعرہ ختم فرما کر رہتے ہیں۔ تو کیا کہوں۔ کہ کیا کیفیت ہوتی ہے اور شاعر نوازوں
 کی نوازش تو عرب کا وہ زمانہ میری آنکھوں کے سامنے لا دیتی ہے جب رات
 رات بھر کسی شاعر مہمان کی خدمت کی جا یا کرتی تھی۔

۲۰۔ جوان :

میرے چار سالہ لڑکے سہاش نے اپنا انگوٹھا دکا کر مجھے چٹکی لکھی ہے کہ میں
 سکول میں داخل ہو گیا ہوں۔ میں نے اسے جواب میں لکھ دیا ہے۔ کہ بیکو ان
 سے میری یہی پرارتھنا ہے۔ کہ بد قسمتی سے تمہارا باپ جس علم کی تکمیل نہ کر سکا۔ تم
 اس کی انتہا کر دو۔

شاید یہی قدرت کا قانون ہے۔ کہ جب انسان خود کسی کام سے عاجز رہتا
 ہے۔ تو اسکی نگاہیں اپنی اولاد میں سے کسی ہستی کو ڈھونڈتی ہیں جو اسکی سپرٹ لے کر

اس کام کی تکمیل کر سکے۔ جیہی کہا گیا ہے۔ کہ ع
پدر اگر نتواند پسر تمام کند

۲۱ جول:

میں نے کئی سال کے بعد اچانک گوشت خوری شروع کر دی ہے۔
اس بیماری کے آغاز میں ڈاکٹر کے کہنے کے باوجود میں نے مچھلی کا تیل اور گوشت
استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ گذشتہ چار ہفتوں سے میرے والد امجد مختلف
دوائی سے مجھے گوشت خوری پر قائل کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ میرا
جواب یہی تھا کہ مجھے اس سخت تربی امتحان میں پورا ترنہ دیجئے۔ زندگی کی
مجدد کے حال میں پھنسا کر مجھے اپنا اصول ترک کرنے کو نہ کہئے۔ لیکن آخر اچھے سینہ
میں ایک باپ کا دل تھا۔ جس کے لئے نوجوان بیٹے کا اس طرح موٹے بستر پر روز
ہو جانا اس قدر سخت چوٹ ہے۔ کہ وہ دماغ سن کر دیتی ہے۔ ایک ایسا طوفان ہے
جو اپنی رو میں ہر اصول کو بہا لے جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے ”عکم“ دیا کہ ستم نہیں
کھانا ہی ہو گا۔ شاید کوئی اور موقع ہوتا۔ تو میں یہ حکم ٹال بھی دیتا۔ لیکن اس
خیال نے کہ ”شاید یہ آخری حکم ہو جس کی فرمانبرداری مجھ ایسے حالات کے ہاتھوں
انجام پائے“ مجھ میں یہ ہمت نہ چھوڑی۔ کہ اس ہستی کا حکم جو دنیا بھر میں میرے
لئے سب سے زیادہ قابل احترام ہے۔ یوں رو کر دوں۔ کہ میری یاد کے ساتھ ہی
یہ تلخ حقیقت اُسے اور زیادہ رنجیدہ کر دیا کرے۔ چنانچہ میں نے جو اصول
اپنی زندگی کی خاطر نہ چھوڑا۔ وہ ایک پیار بھرے دل کے جذبات کے احترام
میں ترک کر دیا۔

۲۲ جون :

گو یا میری شاعری مسلم ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں ایک مرقع ہے جو پہلے
روز ہی سے مجھے اپنی دانست میں شاعر سمجھ رہا ہے۔ اور کئی بار مجھ سے اپنا
کلام سنانے کا تقاضا کر چکا ہے۔ میں اپنے اسجد تک ناواقف سامعین کی شاعر
نوازی کا عالم کیا بیان کروں۔ اب تو اسکی شاعر نوازی اس حد تک پہنچ گئی
ہے کہ اگلے روز وہ ایک خط لایا۔ کہ یہ میں اپنے والدین کو بھیج رہا ہوں۔ وہ میرے
منطق بہت پریشان ہیں۔ اس لئے آپ چند خوب بڑے بڑے شعر دجہ نہیں دے
بیت کہتا ہے، اس پر ان کی تسلی کے لئے لکھ دیں، میں جبران تھا یا اللہ
یہ پڑ گئی اور مصیبت کیسی۔ پیہ تو میں نے سوچا۔ کہ غالب کا یہ شعر
لکھ دوں۔ ع

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اور یقین جانے کہ میں یہ لکھ دیتا۔ تو بھی وہ عاشقِ شعر خوشی سے پھولا

نہ سماتا۔ بہر حال میں نے اسی شعر پر اکتفا کی۔ ع

جو خدا بے جان کو دیتا ہے جان

اُسکی رحمت پر بھروسہ چاہیے

بائیں ہم یہ گلہ باقی رہ گیا۔ کہ کوئی خوب بڑا شاعر تو لکھا ہی نہیں۔

۲۲ جون :

آج وہ مسئلہ درپیش ہے۔ جو ایک مدت میرے دماغ میں ہے۔ لیکن

”کوشش بسیار“ کے باوجود میں آج تک اس کا حل نہیں پاسکا۔

اس سینے ٹوریم میں زنا نہ رہیں بھی ہیں۔ اور دونوں جنبوں کے بہت سے
افراد کی یکجائی کا جو انجام ہوا کرتا ہے۔ وہ یہاں بھی ظاہر ہے یعنی یہاں بھی آنکھیں
لڑ جاتی ہیں۔ یہاں بھی زلفیں اپنے جال میں طائر دل کو پھنسا لیتی ہیں۔ یہاں
بھی حسن پر عشق مچتا ہے۔ بلاشبہ عشق کا دیوتا اندھا ہے۔ جسے یہ علم نہیں
کہ اس سینے ٹوریم میں وقت کے جراثیم چاروں فضاؤں میں محیط ہیں۔ اور کہ اس
میں داخل ہونے والا بھی انکے حملہ سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس اندھے
کو ان باتوں سے کیا واسطہ۔ وہ پھولوں کی کمان لئے بار بار یہاں بھی آتا ہے۔ غالب
کتنی سچی بات کہہ گئے ہیں۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب

جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

یہ سب کچھ صحیح۔ لیکن کیا یہ حیرت کا مقام نہیں۔ کہ موت کے بستر پر دراز
انسان بھی اس سے باز نہیں رہ سکتا۔ اور پھر جب یہ واضح ہو۔ کہ اگر اس مرض
سے بچ نکلنے کی کوئی امید ہو بھی۔ تو ایک مرتبہ کا جنسی تعلق ہمیشہ کے لئے اس امید
کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ لیکن مرلین میں۔ کہ عشق کے کچھ دھاگے سے بندھے ہوئے
ایک دوسرے کی جانب راجع ہیں۔ آخر اس میں کیا بات، کیا راز ہے، یہی مسئلہ
میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اور یہ حادثہ میں نے ان
پر بھی گھٹتے دیکھا ہے۔ جو پیشتر از بس ”کسی“ سے عشق کا دم بھرتے ہیں۔ یا بس ہم
کسی حسین کو دیکھ کر انکا دل بھی ایک کشش سی محسوس کرتا ہے۔ وہ اس راہ چلتے

حسین سے کیا چاہتے تھے اور کس حد تک چاہتے ہیں۔ اسکا تعین ایک ناقابل حل مسئلہ ہے لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ ان کی چاہ غالباً یہیں تک محدود ہوتی ہے۔ کہ وہ اُن سے سنس لوے۔ وہ انہیں بھی اپنا ”سمجھک حجاب کی تکلف داریاں اٹھا دے۔ بس اتنا ہی۔ یہی جذبہ آخر ہے کیا شے کیا یہ گناہ ہے؟ اگر ہاں۔ تو پھر انسان اس بارے میں بے بس کیوں ہے؟ تو کیا یہ عین قدرتی ہے۔ تو پھر اسکو برا کیوں کہتے ہیں؟ کیا کوئی دانائے راز کمال مہربانی کے جذبہ سے مجھ ناچیز کو اسکی حقیقت اور وجہ پیدائش سے آگاہ کرنے کی تکلیف گوارا کرے گا۔ تاکہ اس ”شاید آخری“ وقت میں میرے دل کی بلبل نشانت ہو جائے۔

۲۵ جون:

گذشتہ ماہ کی ڈائری پڑھ کر جن دو باتوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ان میں سے جناب طائر کی رائے قابل غور ہے۔ آپ بھی آغاز میں دوسروں کی طرح کانٹوں پر گھسیٹنے والی باتیں لکھی ہیں پھر کہتے ہیں۔

”مجھے ایسا خیال آتا ہے۔ کہ جس شخص کو پہلے پہل سینے ٹور دینے کا خیال پیدا ہوا۔ وہ علم نفسیات سے بالکل بے بہرہ تھا۔ سینے ٹور دینے کی رہائش قلبی سکون کا باعث نہیں ہو سکتی۔

ایسی پر ہول واوی میں جہاں بیمار دل کے داغ پر ہر وقت موت کی دہشت تسلط رہتی ہے۔ وائٹس بائیں آگے پیچھے مریضوں کے او اس چہرے نظر آتے ہوں اور جس جگہ کے لیکنوں کے دل پر ہر وقت یہی خوف طاری رہتا ہے کہ تو کا خوفی عتاب جو ہر وقت اس او اس واوی پر پڑ پھیلانے رہتا ہے۔ نہ جانے

کب کسی کے طائر روح پر چھٹا مارے۔ کبھی محتبانی کی امید ہو سکتی ہے؟

تہاے اس شاہکار کے لفظ لفظ سے مایوسی اور سوز ٹپکا پڑتا ہے اس مضمون کا عنوان تہاے احباب کے لئے تیرنیم کش سے کم نہیں۔ تم نے کیا یہ بھی سوچا کہ پڑھنے والے تہاے دوستوں کے دل پر ان الفاظ نے کتنے چر کے نگاہیں خدا کے لئے اس پر سوز اور المیہ نثر نگاری کو چندے ملتوی رکھو۔

ایک حقیقی دوست جذبات کیا ہو سکتے ہیں۔ یہ خط اس کا مرقع ہے لیکن رات کو رات نہ کہنے سے اس کی اندھیری میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔ تو پھر تیرنیم کش کے لازمی انجام سے انکار کئے کیا معنی۔ دن میں مبتلا ہو جانے کے معنی یہ ہیں۔ کہ آپ کی روح کے خلاف کسی ملک الموت نے ڈگری جاری کر دی ہے۔ اب یہ علیحدہ بات ہے۔ کہ آپ عدالت کے اس چیرپراسی کی طرح جو ڈگری اجرا کرنے کا پروانہ لے کر آتا ہے۔ اس ڈگری دار کو بھی مسلسل پوہم رشوتوں سے چند سالوں کے لئے اس کا اجراء رکوا لیں۔ لیکن آخر کار وہ ہو کر ہی ہے گا۔ پھر اس سے خون کیوں؟

غمر ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جاتیے
بے حد ہو جائیگا یہ ساز ہستی ایک دن

۲ جولائی؛

آج ڈسپنسری میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں قہمیٹروں میں ملبوس چند دیہاتی بیٹھے تھے کسی مریض کو لائے تھے جو قریب ہی چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔

اُس نے اپنے ایک ساتھی سے ہماری جانب اشارہ کر کے کچھ پوچھا ساتھی نے نہ جانے کیا جواب دیا، البتہ اُس تجبیف و زار مرض نے اس کے بعد کچھ ایسی نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ جن میں نفرت نمایاں تھی۔ البتہ اس نفرت کے کناروں پر کہیں کہیں رحم کی رنگت بھی جھلک رہی تھی۔

وائے یہ تپدی۔ کہ وہی آنکھیں اگر ہمیں اس ہسپتال سے باہر دیکھتیں تو ایک خوش پوش نوجوان کے سامنے شاید زمین سے اوپر نہ اٹھ سکتیں۔ لیکن آج وہ ہماری پوشاک میں نہ اٹک کر ہمارے پھیپھڑوں تک پہنچ گئی ہیں۔ اور ہم ان رحم آمیز نگاہوں کی تاب نہ لا کر اُس مرض کی جانب اُنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے۔

لوٹتے وقت رزاق شیخ کہنے لگا۔ یہ جو ہمیں اس طرح گھو رہا تھا۔ اگر پانچ ہی منٹ کے بعد اسے بھی ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ تمہیں تو تپدی ہے، پھر.....! ہم سب ہنس پڑے جیسے اس ایک بات ہی سے ہم اپنی کمتری کے بوجھ سے سبکدوش ہو گئے۔

انسانی ذہنیت..... انسان خود گرتا ہے۔ تو دوسروں کو بھی اپنے ساتھ گرا کر تسکین پانے کی سعی کرتا ہے۔

کئی مرتبہ میں نے دیکھا ہے۔ کہ مریض اکٹھے بیٹھے ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں ”دیکھو وہ فلاں درخت بالکل سوکھ گیا ہے۔ اس کے پتے بھی پیلے پڑ گئے ہیں۔ یقیناً اسے بھی دق ہو چکا ہے۔ وہ پرلا پیڑ ابھی آدھا رہا ہے۔ اسکا دق ابھی پہلے مرحلہ پر ہے وغیرہ وغیرہ“ اور مجھے ان باتوں کی نہ میں بھی انسان کی وہی ذہنیت نظر

آتی ہے جو دوسروں کو اپنے جیسا دیکھ کر سکون پاتی ہے۔

۴ جولائی:

ایک نیا ڈوگرہ مریض میرے ساتھ والے کمرہ میں آیا ہے۔ کسی سگری فائر کا کلرک ہے لیکن اس قدر نرم دل کہ بات بات پر رو دیتا ہے۔ بیوی کا خط آیا تو رو دیا۔ کھانا کھانے لگا تو بیوی کے ہاتھوں کا بنا کھانا یاد آیا اور دو دیا۔ رات کو سونے لگا۔ تو کوئی یاد آگیا اور رو دیا۔ ڈاکٹر نے آکر حال پوچھا۔ تو رو دیا۔ کسی نے پوچھا کتنے بچے ہیں۔ آپ کے تو رو دیا۔ صبح اٹینہ میں اپنا منہ دیکھا تو رو دیا غرضیکہ روز درکار اپنے آپ کو ہلکان کٹے جا رہا ہے۔ میں آج اس کی ڈھارس بندھانے کی غرض سے ایک دو گھنٹے اس کے پاس بیٹھا ہوں۔ وہ بار بار اپنے بچوں اور بیوی کا تذکرہ کچھ اس پیرائے میں کرتا رہا کہ خود مجھے رلائی آئی جاتی تھی۔ بہر حال مشکل تمام اسکی بہت کچھ ڈھارس بندھا آیا ہوں۔

اس کی ڈھارس تو بندھا آیا ہوں۔ لیکن اس اپنے دل کو کیا کروں، جو اس وقت سے خود اپنا چین کھو بیٹھا ہے۔ اور ہر لمحہ میرے چینی اور بے کلی بڑھتی جا رہی ہے، ڈرتا ہوں کہیں مجھے بھی روانہ پڑ جائے۔

۵ جولائی:

صبح سے طبیعت میں ایک اضطراب سا موجود ہے۔ کل کا اثر ابھی تک باقی ہے حتیٰ کہ شام چھ بجے کے قریب ہلکی سی حرارت محسوس ہونے لگی۔

۹ جولائی:

شام کے وقت حرارت باقاعدہ ہو گئی ہے۔ کئی ہفتوں سے جو طبیعت کچھ

سبھی کو اتنی اسکو پھر ایک دھچکا سا لگا ہے۔ جس موت کو کسی حد تک بھول گیا تھا۔ اس کی ایک واضح اور معین شکل پھر آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے پھر وہی پرانی باتیں یاد آنے لگی ہیں۔ انہی دنوں وہ غزل کہی ہے جس کے مطلع کا مصرع ہے۔

پھر وہی میں ہوں وہی صحرا وہی برا بویاں

۴ ارجولائی:

شام چھ بجے کا بخار گویا مستقل ہو گیا ہے۔ چار بجتے نہیں۔ کہ چھ بجے آنے والا بخار ایک دہم کی صدمت میں میرے دماغ پر تسلط جمانا شروع کر دیتا ہے۔ چار پانچ سے حرکت تک کرنا بند کر دیتا ہوں۔ ہزار احتیاطیں کرتا ہوں کہ اسوقت حرارت نہ ہو جائے۔ فیض۔ خیرا سنی لال شنبھو نا تھا۔ گوپال داس سب کے سب میرے کمرہ میں آکر دھچپ دھچپ موضوع چھیڑتے ہیں۔ تاکہ میرا دھیانا بٹ جائے۔ لیکن بخار کا بھوت ہے۔ کہ میرے سر سے کسی طور نہیں اترتا۔ ان ربیلی باتوں اور گوپال داس کی بیٹھنی تانوں کے باوجود ایک لمحہ کے لئے میں اس خیال کو دماغ سے باہر نہیں کر سکتا۔ کہ ”چھ بجے بخار آئیگا“ حتیٰ کہ چھ بجے تھر تھر لگانا ہوں اور بخار موجود ہوتا ہے۔ سب کہتے ہیں۔ کہ یہ حرارت تنہا ہے دہم کی تخلیق ہے۔ اور میں بھی مانتا ہوں۔ لیکن یہ دہم۔ یہ کس طرح دور ہوا ایک دفع باقیہ“ مریض کے لئے تو شاید یہ ناممکن ہے۔

۵ ارجولائی:

بخار بھی ٹوٹا اور دہم بھی۔ یہ بھی ایک دھچپ اقعہ ہے۔ میرا نخرنا میرٹ

ٹوٹ گیا۔ نئے تھرمائیٹر کے لئے شہر میں لکھ بھجوا۔ جو تین روز میں آیا۔ اور جتنے دن وہ آیا نہیں جو تھرمائیٹر لگانا نہیں ہوتا تھا۔ اسلئے شام کی احتیاطی تدبیر سے لاپرواہی برتی گئی۔ کہ یا خارجی طور پر وہم کے بندھن ڈھیلے پڑ گئے۔ جسکا انجام یہ ہوا۔ کہ آج جب شام کو درجہ حرارت دیکھا۔ تو بالکل نارمل تھا۔ گویا اتنے دن مجھے بخار نہیں وہم تھا۔

وائے بر حال مامریض

۱۸ جولائی:

گزشتہ دنوں جب مجھے بخار آجاتا رہا۔ تو ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ تمام دن بستر پر (جسے موت کا بستر کہنا زیادہ موزوں ہے) لیٹے لیٹے انسان کی دلی کیفیت نہایت مایوس کن ہو جاتی ہے خصوصاً اسوقت جب مجھ جیسا عمر مزاج اپنی کھڑکی میں سے بادلوں کے کاروان کسی نامعلوم منزل کی جانب جاتے ہوئے دیکھے۔ جب وہ دیکھے کہ کئی رند قسم کے بادل گلن مرگ کی سفید چوٹیوں سے لپٹ لپٹ جاتے ہیں۔ جب وہ مے نوش مستی کے عالم میں ایک دوسرے سے ٹکرا لگتا جاتے ہیں۔ اور سینے ٹوریم کی گھاٹیوں میں کھڑے سرور و صفا یہ نظائے دیکھ کر نہ صرف جھوم جھوم جاتے ہیں۔ بلکہ اسی بہانہ کوئی تن اور کسی سرور و قد کے گلے میں باہیں ڈال لیتا ہے۔ جب وہ مریض ان نظاروں کو دیکھ کر دلوانہ وار ان وادلوں میں ادھر سے ادھر بھاگتا چاہے۔ گیت گانا چاہے۔ لیکن ڈاکٹر کا حکم اُسے چارپائی سے بندھا ہونے پر مجبور کرے۔ تو نہ پوچھیے۔ کہ دل کی کیا حالت ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے۔ کہ یا تو ان بندھنوں سے آزاد ہوں۔ اور اگر

مذوق مریض کے لئے چھٹکارا ممکن نہ ہو۔ تو مرجانا بہتر ہے۔ اور وہ بھی بہت جلد یہ بھی ایک عجیب وقت ہوتا ہے۔ جب مرجانے کا یقین تو ہو۔ لیکن موت آتی نہ ہو۔ پچانسی کی کوٹھڑی میں مجبوس شخص کو یہ تو ڈھارس ہوتی ہے کہ چلو فلاں روزانہ مصائب کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن ہم تو اس سے بھی بدتر ہیں۔ موت کی وادی میں چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ تیرنیم کش "چھوڑنے والے" شکاری موجود ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہیں۔ کہ اس کا کونسا تیر جان لیوا ہو گا۔ ع

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی غالب

۲۰ جولائی:

مٹی اور جون کی ڈائری پڑھ کر کئی دوستوں کے خطوط پے درپے موصول ہوئے ہیں۔ ایک عزیز دوست کی بیوی نے جنہیں مجھ سے بہت ہمدردی ہے ایک ہی سطر میں اُن تمام غلبے چوڑے خطوں کے مضامین کو بند کر دیا ہے۔ کفنی ہیں آپ کی ڈائری کے ایک ایک لفظ سے یاس و حسرت ٹپکتا ہے۔ لیکن وہ دن کہاں گئے جب آپ ہم سے بڑے آشنا وادی کہلانے تھے جب بڑی سے بڑی آفت کے وقت بھی اُس کھلے ہوئے چہرہ سے مسکراہٹ جدا نہ ہوتی۔ تو آج ایسا کیوں؟

اگر اس ایک خط کا جواب دیدوں۔ تو سمجھئے دیگر تمام دوستوں کو میرا جواب پہنچ گیا۔ اور ان محترمہ کو ان دو مصرعوں کے سوا اور جواب بھی کیا دے سکتا ہوں۔

۷ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درو بھر جائے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار "تبدیق" ہمیں رلائے کیوں

۱۶ اگست

ایک ماہ ڈائری خاموش رہی ہے۔ آخر ہر روز نئی باتیں لکھنے کے لئے کہاں سے آجائیں۔ یہاں کے روزمرہ کے معمول سے مانوس سا ہو گیا ہوں۔ کچھ طبیعتیں سنھل رہی ہیں۔ کچھ مرنے کے لئے گھر چلے جاتے ہیں جو نئے آتے ہیں۔ اسکے چہرہ دل پر وہی افسردگی اور ملال جو تازہ داروان وادی دق پر طاری ہوتا ہے انہیں میرے لئے کوئی نئی بات نہیں رہ گئی۔ میں نے یہ جگہ کچھ اس طرح اپنائی ہے گویا ہمیشہ سے میرا ہی گھر تھا۔ سچ ہے "دلی زخموں پر بہترین بھاپا وقت ہی رکھتا ہے" کبھی کبھی کوئی خاص واقعہ سن لیتا ہوں۔ تو جذبات میں تھوڑا بہت ہیجان واقع ہو جاتا ہے۔ جیسے اپنے ایک نئے دوست کا واقعہ ابھی کل ہی سنا ہے۔ اسے جب اسپینے گوریم میں آنا تھا۔ تو وہ بھائی کے ساتھ بازار سے نیا بوٹ لینے گیا۔ قدرتی تھا کہ وہ لوگ سودا کرتے وقت بوٹ کی مصیبت طی خوبصورتی وغیرہ کا اندازہ کر رہے تھے۔ لیکن اس کا بیان ہے کہ مجھے ان کی متعیناتوں سے چڑا رہی تھی اور سوچ رہا تھا کہ کوئی معمولی سا بوٹ لے لیا ہے جو چار پانچ ماہ کا گزارہ کر دے اس کے بعد کس نے رہنا ہے ماورکون اسے پینے گا؟

یہ ایک بات انسان کی ذہنی کیفیت کو کتنا اجاگر کر رہی ہے۔ بہر حال ایسی ہی کوئی بات سن لوں تو طبیعت پر اثر ہوتا ہے۔ ورنہ طبیعت بہت ہلکی رہتی ہے

مزاح کا پرانا عنصر پھر سے غالب ہے۔

سوچنا ہوں کہ اللہ میاں میں بھی مزاح کا کچھ نہ کچھ مادہ ضرور ہے۔ ایک نمونہ یہیں دیکھئے۔ ہمارے ہسپتال کا بڑا ڈاکٹر چھوٹے ڈاکٹر سے قد میں ڈیڑھراشت چھوٹا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ بڑا کسے کہیں اور چھوٹا کسے۔

۱۵ ستمبر

تبدیق کے مرض کی ایک دلچسپ تشبیہ سوچھی ہے۔ کیا یہ اور مرض عشق ایک دوسرے سے ہر طور مشابہ نہیں۔ مریض عشق کا کلیجہ بھی زخموں سے پھلنی ہو چکا ہوتا ہے جیسا کہ ذوق نے کہا ہے۔

دل نے زخموں کی ترقی سے عجب پائی بہار

پہلے تھا صبرِ بگ یہ گل اب ہزارہ ہو گیا

اور مریضِ دق کو بھی عین اُسی جگہ (پھیدھیرٹوں میں) زخم ہو جاتے ہیں۔

مریضِ عشق بھی ہوئے ہوئے سوکھ کر کاٹا ہونا تاکہ ہے اور یہی عالم مریضِ

دق کا ہے وہ بھی جھجھکر کرتا ہے اور یہ بھی وہ بھی ایک لاعلاج مرض ہے اور

اسکا بھی آج تک کوئی واضح علاج نہیں ڈھونڈا جا سکا۔

ان تمام باتوں کو سوچتے سوچتے بار بار مجھے شک ہونے لگتا ہے کہ ہم

لوگ مرضِ دق میں مبتلا ہیں یا مرضِ عشق میں۔

مرضِ عشق کا ذکر چھڑا ہے۔ تو اسکی نفسیات کے متعلق بھی کچھ سنئے ہیں

چار پانچ ماہ ہوئے۔ یہ سوال پوچھا تھا کہ ”یہاں موت کے بستروں پر پڑے پڑے

بھی آنکھیں کیوں لڑ جاتی ہیں۔ اس جنسی کشش کا کیا باعث ہے“ اس کا

جواب مشہور افسانہ نگار جناب راجندر سنگھ بیدی نے دیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ جنسی کشش جسے بعد ازاں لوگوں نے محبت اور عشق کا نام دے دیا۔ ایک قدرتی حقیقت ہے۔ جو روز ازل سے ہر اس موقع کو تلاش کرتی رہتی ہے جب وہ اپنے تئیں ثابت کر سکے۔ قدرت نے اسکو وحدت و کثرت کے بندھن میں نہیں الجھایا تھا۔ یہ تو ہماری مختلف مجلسوں نے اپنے اپنے تنگ نظریہ میں انہیں جکڑ لیا اور جہاں بھی یہ مجلسی بندھن رتی بھر ڈھیلے ہو جاتے ہیں یہ اپنی طاقت دکھاتی ہے۔ یہ نہ ہوں جب بھی یہ اپنے وجود کو پیش کرتے ہیں کوشاں رہتی ہے۔

اور یہی حقیقت بھی ہے۔ ہم لوگ ایک حقیقت کو ڈھونگ کر کے پروہ میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ورنہ میں نے کوئی شخص نہیں دیکھا۔ جو حسن کو دیکھ کر متاثر نہ ہو۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ڈھونگ کر کے اس جذبہ کو غیر قدرتی طریقوں سے دبایا جائے۔ دور کیوں جانیے۔ اپنی عبادتگا ہوں کو دیکھے۔ جہاں ہم لوگ پوجا پاٹ کا ڈھونگ چاٹے ہوتے ہیں۔ وہاں بھی میں نے آنکھیں لڑتی دیکھی ہیں۔ بہت قدر رشتہ داروں میں یہ حقیقت نمایاں دیکھی ہے۔ اور پھر یہ کشش کسی کو اپنی غیبی موزونیت کا احساس تک نہیں ہونے دیتی۔ ایسے ہی ایک سینے ٹوریم کے رسوئے کا ذکر ہے جس پر یہ مثال صادق آتی تھی یہ آنکھوں سوچے نہ او نام نہیں سکھائیے ایک مریضہ کے نام جو ایم۔ اے کی طالب علم تھی۔ ایک رقعہ لکھا۔ جس میں یہ شعر لکھا تھا۔

نہیں برق تپاں ہر گز مشابہ قلب مضطرب سے

یہ تڑپے ہر گھڑی ہر دم وہ تڑپے جبکہ مینہ برسے
یہ تو بے چارہ باورچی رہا۔ میں نے دوسرے کئی ہسپتالوں میں ان بڑے
بڑے ڈاکٹروں کو جو دوسروں کو تپدق کئے مریض سے دس دس فٹ دور رہنے
کی تلقین کرتے ہیں۔ کسی کسی حسین مریض کے بستر پر گھنٹوں بیٹھے بیٹھی بیٹھی باتیں
کرتے دیکھا ہے۔ حالانکہ ان سے بیٹھی بات کی توقع سو رچ جیسے سائے کی منشا
کے برابر ہے۔

یہیں وہ بھورا سا کتا بھی ہے۔ جسے ہمارا جھوٹا کھانا کھا کر دق ہو چکا
ہے۔ وہ ہر روز سو کھتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن اب بھی میں نے اُسے اپنی روٹی
اُس مشکلی کتیا کو کھلاتے دیکھا ہے۔ جس کے گرانے کا ان دنوں موسم ہے۔ اس قدر
مستند مشاہدات کے باوجود اس بات سے حیران ہونا کہ موت کے سایہ میں بھی کیوں
یہاں محبت کے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ یقیناً نادانی ہے۔ اس دنیا کی حقیقت ہی
ایسی ہے یہ تو خیر دق کا ہسپتال ہے۔ تو لوگوں کا اس طرح ہلنا گانا عجب کا
باعث ہے۔ ورنہ اگر وسیع نظری سے دیکھا جائے۔ تو کیا ہسپتال سے باہر تمام
لوگوں کو اپنی لمبی زندگی کا اعتبار ہے۔ کون سے جو کسی بھی وقت موت کا شکار
نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی لوگ بڑے بڑے محل اور قلعے تعمیر کرتے ہیں جیسے انہیں
ہزاروں سال زندہ رہنا ہے۔

سلمان سو برس کا کل کی خبر نہیں

۱۰ اکتوبر

مہینوں گزر گئے ہیں۔ ہر روز کی ایک ہی طرح کی زندگی سے اُدب گیا ہوں

کوئی نئی چیز کھنے والی نہیں۔ البتہ بیٹھا بیٹھا مختلف لوگوں کے قلمی خاکے بنا یا کرتا ہوں۔
منو نہ دیکھئے اپنے ڈاکٹر طریح آزمائی کی ہے۔ آخر وہ ہر روز ہم پر ہوا میٹس آنا تے ہیں
ہم نے ان پر طبع آزمائی تو کیا ہوا۔

اُن کی سب سے بڑی خصوصیت انکی آواز ہے۔ جسے اگر کسی چیز سے تشبیہ دی
جاسکتی ہے۔ تو وہ نفرتی گھنڈیوں کی آواز سے۔ یہاں تک کہ اگر انہیں پر وہ کے
پچھے سے بولنے کے لئے کہیں تو انکی تانیٹ و تانیر میں تمیز نہ کر سکیں۔ اور بولوں
بھی تھے مٹے اور نازک نازک اعضاء و جوارح میں نسانیت کا پہلو زیادہ ہے رنگ
خوب چٹا ہے۔ باریک تر چھپا سا قدر گدراوسط سے کچھ کم جیسے کوئی تنہا سا سرد
کا بوٹا ہو۔ عینک کے تالی اس چھوٹے سے منہ کیلئے بہت بڑے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا
ہے۔ کہ کوئی بچہ اپنے باپ کی عینک لگائے پھرتا ہے۔ باپ ہمہ عینک حسن میں
اعضا فر کر رکھا ہے۔ اسطرح اودھ کئی مونچھوں نے بھی جنکا فیشن لارڈ کمزرنے
شاید انہی کے پیش نظر نکالا تھا۔ لیکن ایسے سندر کھڑے کو بھی انہوں نے کبھی نہ ہنسنے
کا عیب لگا رکھا ہے۔ اسکی ایک جہ بھی ہے کہ انہیں غیر معمولی لیاقت باعث چھوٹی
سی عمر میں ایک بہت بڑا عہدہ مل گیا ہے۔ اب انکے پاس اپنے ماتحت بوڑھوں
پر رعب رکھنے کے لئے بارعب خاموشی کے سوا کوئی طریقہ نہیں۔ اور اسکو کجرا انکی
بدلتی سنجی اور اب وانی اس بے کیف اور مجبور کی خاموشی کی موٹی تہ کے نیچے
گھٹ گھٹ کر دم توڑ رہی ہیں۔ بہر حال ہسپتال میں نہایت سختی سے راج کرنے
کے عادی ہیں۔ حتیٰ کہ مجھ ایسے جرنلسٹ مریض سے بھی انہوں نے کبھی دلچسپی سے
بات کہنے کی کوشش نہیں کی۔ خود بڑے بڑے شہروں کے ترقی پسند کالجوں

میں ڈکٹیوں کے ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ اور یوں بھی روحانی اور شاعرانہ طبیعت کے مالک نظر آتے ہیں۔ لیکن ہسپتال میں اس سلسلہ میں نہایت سخت گیرانہ پالیسی کے حامی ہیں۔

شاید انکی ظاہری نہ ہدراچی کار و عمل ہے کہ صبح جب مریض کے پاس آ کر تقری گھنٹیوں جیسی آواز میں پوچھتے ہیں کہ ”سناؤ مسٹر“ کیا حال ہے۔“ تو بد حال مریض بھی ایک بار تو اپنے تنہیں خوشحال محسوس کرتا ہے اور آپ رحمت کا مجسم فرشتہ دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن جب لاؤڈ سپیکر سے گانے کی پوری آواز نہ سنائی دے رہی ہو اور مریض کسی چیز اسی سے ریڈیو کی ٹون ادبھی کرنے کو کہیں۔ اور یہ جواب ہے کہ ”ڈاکٹر صاحب دفتر میں کام کر رہے ہیں۔ اونچا نہیں ہو سکتا۔“ تو مریض تصور ہی تصور میں آپ کو مالبوسی کا دیو سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ جسکے لمبے لمبے اور ڈراؤنے دانت ریڈیو کے پیٹ میں کھبے ہیں۔ اور پھر لوں محسوس ہونے لگتا ہے۔ جیسے ریڈیو کا نہیں ہا۔ بلکہ در کے مائے دھیمی دھیمی آواز میں کراہ رہا ہے۔ کاندھے پر کوٹ لٹکا کر دفتر سے گھبراتے وقت آپ پر وہ عالم ہوتا ہے۔ جیسے پہلی جماعت کے بچے چھٹی ہونے پر گھر جاتے ہیں۔ البتہ حال کا یہ عالم ہے کہ سیر کو بھی جاتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا کسی ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ یا شاید انہیں گھر کی سرکار سے چھٹی ہی تھوڑی ملتتی ہے البتہ ایک کام میں عجلت کرتے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ اور وہ ہے مریض کی شخصیت۔ آپ انہیں ذرا بھر تکلیف بیان کیجئے۔ گھنٹوں آپ کا معائنہ کرتے رہیں گے۔ اور یہی باعث ہے کہ آپ جس روز نہ ہوں۔ ایک بھی مریض کی تسلی نہیں ہوتی

واللہ اعلم بالصواب۔

۴ اکتوبر:

صحت قریب قریب ٹھیک ہو چکی ہے سر وی کا زور ہو جانے کے باعث تمام ساتھی جا چکے ہیں۔ اسی رات کے قریب ایک امیر مسائی نے نوکر کے ہاتھ کہلا بھیجا۔ کہ کل صبح موٹر آ جائے گی۔ اور کوچ ہوگا۔ مجھے اتنا تک نہیں پوچھا۔ کیا آپ بھی چلیں گے؟

ہاں۔ جانے وقت کون کسی کامیت۔

اس سینے ٹوریم کی برسی ہوئی بدلی میں ابھی کئی بجلیاں موجود ہیں جو چشمزدن میں میرے خرمین سکون کو خاک کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ سر نیدر سنگھ ایک تیسرے درجہ پر پہنچا ہوا مریض ہے۔ ایک روز بھی وہ چارپائی سے اٹھ کر برآمدہ تک نہیں آیا۔ آج چار سال سے چارپائی کے ساتھ چارپائی ہو چکا ہے۔ لیکن واہے شیر دل۔ میں نے ہمیشہ اُسے ہستے ہی دیکھا ہے۔ جب جاؤ آپکا دامن سستی کے پھولوں سے بھروے گا۔

لیکن آخر وہ انسانیت سے نر ہو سکا۔ آج وہ پھوٹا اور اس طرح کہ ایک بازو اسکا تمام بستر بھیک گیا۔ مشہور ہجر من فلا سفر تھے کی طرح جب وہ مرنے پر آ گیا۔ تو کئی ایک کوڑا کر بھی چپ نہ ہو سکا۔ اُسکا رونا بھی سچ ہے۔ چار سال تک اُسکا بوجھ اٹھا کر اب گھرو لے بھی نہ سکے ہیں۔ وہ اب ہر ایک پر بار ہے۔ اس مرحلہ سے واپس لوٹ نہیں سکتا۔ بروکے دروازہ تلے بیٹھا سبک ہا ہے۔ لیکن وہ سنگدل اپنا دروازہ نہیں کھولتی۔ گفتار قوت خیز

انجام ہے۔

اُسکا انجام سامنے ہے۔ اپنے انجام کی سوچنا ہوں۔ اس سے بھی زیادہ مایوس کن ہے۔ میرا مرض ابتدائی مرحلہ پر ہو نیکی باعث مجھ سے متعلقہ احباب کے دل میں ابھی امید باقی ہے۔ چنانچہ جس طرح بھی کریں انہیں میرے شاہی اخراجات برداشت کرنے ہی ہیں۔ اُس کی ناامیدی میں موت کا سکون ہے۔ میری امید میں زندگی کا اضطراب۔

جب اس مرض سے چھٹکارا حاصل کر کے بھی کوئی کام نہ کر سکو ننگار زندگی کی جدوجہد میں حصہ نہ لے سکو ننگار۔ تو زندگی سے کیا حاصل۔ اگر یہ مرض مجھے اس طرح ناکارہ کر کے موت کی سکون زا دوا دی سے لوثا لینا چاہتا ہے۔ تو میں اپنے ہاتھوں سے موت کا دامن تھام کر اس سے بدر کر کیوں نہ لوں؟

۱۵ اکتوبر:

علی الصبح سرور پانی سے نہایا۔ چھاتی میں درد ہونے لگا۔

۲۲ اکتوبر:

پہلے پانچ روز تو درد کی معمولی دوا کرتا رہا لیکن اب اسکا تسلسل ڈر اوٹا معلوم ہو رہا ہے۔ انسان عجیب ہے۔ کئی مرتبہ کہتا ہے۔ خود کشتی کر لو ننگار۔ لیکن جب خود موت رو برو ہوتا ہے۔ تو اسے پھر ڈر معلوم ہونے لگتا ہے۔ کسی کو کہتا ہے مجھ پر بندوق داغ دو لیکن عین گولی چلنے کے وقت بندوق کا منہ ہاتھ سے بند کر نیکی کوشش کرتا ہے۔ گھر سے سندسبہ آیا تھا۔ کہ ۲۱ اکتوبر کو اچھا مہورت ہے۔ چلے آؤ لیکن وہ کیا جانیں۔ یہاں تو..... بن بن کے بگڑتی ہے یہ قسمت مہری۔

۳۔ اکتوبر :- درو کو فائدہ ہے۔ گھر جانے کیلئے مہوت کا انتظار ہے۔ ڈاکٹر وک جھوٹا بات دی
 ہیں۔ وہ بالوس کن ہیں۔ یہ نہیں کہنا وہ نہیں کہنا بہت پیدل نہیں چلنا سائیکل
 نہیں چلانا گھوڑے پر نہیں چڑھنا چڑھائی پر نہیں جانا۔ خوراک شاہی کھانا۔ وہ
 کھانا یہ کہنا۔ فلاں دوائی کھانا۔ کوٹھی میں رہنا۔ گرمی میں پہاڑ پر جانا اور خدا جانے
 کیا کیا کچھ، یہ سب کچھ بالوس کن ہے اسلئے کہ مجھ ایسا متوسط طبقہ کا انسان کیا سب
 کچھ بناہ سکے گا۔ اور پھر متعلقین پر ایک بے فائدہ بار بننے سے حاصل ؟

۳۔ نومبر :- کئی طرح کے خیالات باوجود میں اتنا کمزور بہت نکلا۔ کہ آخر آج گھر آ ہی گیا۔
 چلتے وقت ڈاکٹر نے کہا کہ آئندہ موسم گرم گدا بھی پہاڑ پر بسر کرنا چکیں میں
 سوچ رہا تھا۔

کس کو نصیب ہوتے ہیں پھر عیسے ہائے عیش
 جیتا ہے کون دیکھے اگلی بہار تک

۸۔ دسمبر :- لاہور کو دھڑکتے دل کیسا تھروانگی ہے۔ سر نیگہ بھی خوب نے سے دن کٹے
 جیسے کسی کو تاریک خانہ زنداں سے یکجہ کسی راج دربار میں لیجا جائے جہاں حسن
 کے پاؤں گھنگر دوں کی آواز پناج ہے ہوں۔ اور زندہ لباس شہزادے سوا جھال
 رہے ہوں۔ ایک ایسا ہی قصائد تھا میرے ساتھ بھی، سینے ٹوہیم کی تنہائیوں سے گھر
 آیا۔ تو خیر بنج کے بیگیو پڑت پر گھر میں حشر تھا۔ بس پھر کچھ نہ پوچھیے۔ وہ رات رات

بھر ایک طرف خوش گلوں کے دلوں میں اتر جانے والے گیت اور ان کے مقابلہ
میں اس نوجوان پارٹی کا جسکے سر غنہ موہن لال تھے۔ وہ ماہیا گانا۔

ہاراں دیاں پنچ لڑیاں تیرا پچھا نہیں چھڈنا

بھاویں لگ جان تنہکڑیاں

ادھر گلاب ویدی کے گنگر وادھر سائیں اندر واس کی ستار وادھر شام انی
کے ناچ ادھر ننھے روی کی شیطانی غرض خوب وقت کٹا۔ اور میں قتی طور پر تپتی
تو کیا خود اپنے آپ کو بھول گیا۔ لیکن تاجکے۔

پھر وہی میں ہوں وہی

بہر حال لاہور جا رہا ہوں۔ کئی پھڑے ہوئے دوستوں سے ملنے کے
خیال گدگدائے ہیں۔

۱۱ جنوری ۱۹۴۲ء:

ٹیکسلا کے کھنڈرات دیکھتا ہوں۔ "دسمبر کو لاہور پہنچ گیا۔ اُن لوگوں سے
آخری مرتبہ ملیا تھا۔ پھر ملتا یقیناً پوسٹ میں تھا۔ پیر جنم کا احساس تھا۔ پارٹیاں
دی گئیں۔ دعوتیں کھائیں۔ مبارکبادیں وصول کیں۔ لیکن یہ سب کچھ ایک قتی روشنی
تھی۔ جو ٹوٹنے والے تائے کی طرح ایک بار آنکھوں کو خیرہ کر کے پھر اندھیلے
میں غائب ہو گئی ہے۔

پھر تار بکی ہی تاریکی ہے۔ ڈاکٹر ہیں۔ کہ اپنی کہے جاتے ہیں۔ "خبردار کوئی کام
کیا تو ابھی قطعاً آرام کہ دوسرے مرض کے عود کرنے کا خطرہ ہے۔ خبردار خود کو
لا پرواہ نہ ہونا" اور پھر سینکڑوں پے ماہوار کے حساب چارٹ بنادیتے ہیں اور جبکہ

دیتا ہے کہ اُس نے اچھے بھلوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے کھاتے پیتے گھرانے بھول
مرنے کی تیاری میں ہیں اور پھر تپدق کا ایک لپسا مزہ مرلیض

کون ہے جو اسکے دل کی کیفیت کا اندازہ کرے جسے تندرست ہونے پر ملنے والی
ہر نئی مبارکباد ایک تازیانہ کی صوت میں جو کھاٹی دیتی ہے۔

دل بار بار جو غم باندھتا ہے۔ اسے گناہ سمجھ کر ہر بار دبا دیتا ہوں۔ لیکن ہری
اختر کا یہ شعر سنتا ہوں۔ تو سوچتا ہوں۔ کہ یقیناً یہ گناہ نہیں۔
ناؤ کو اک ساحل تو ملا ہے طوفانوں سے چھین تو ہے
موت ہے اچھا موت سہی میں اس گھاٹ اترتا ہوں

۷۔ ارفوری:

تاریکی زیادہ گہری ہوتی چلی جا رہی ہے۔ بیماری کے دنوں میں میں جن
دوستوں کی توجہ کا مستحق تھا۔ اب انہیں میری کوئی شغفیں نہیں رہی۔

اس وقت انکے القات کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ یہ عنقریب مر جائیگا
اسلئے اگلے روزانہ معمول میں میری موت ایک کاٹا بنی رہتی تھی۔ جسکے باعث میں
انہیں یاد آجاتا تھا۔ گو ہمدردی کے فلسفہ کمیٹا بق نفرت کے ردِ عمل کے طور پر یہی
لیکن اب جبکہ میری موت بہت نزدیک نظر نہیں آ رہی جہاں والوں کو اتنی فرصت
کہاں۔ کہ میری جانب آنکھ اٹھا کہ دیکھیں۔ یہاں باعمل کیلئے زندگی ہے لیکن
ڈاکٹری مشورہ کمیٹا بق میں باعمل نہیں ہو سکتا۔ اور بے عمل کے لئے ہسپتال موز
جگہ ہے لیکن وہاں سے نکال دیا گیا ہوں۔ چنو کسے سناؤں کہ میرے لئے مرلیض ہو کہ
ہسپتال میں چلا جانا اس سے کہیں آسان تھا۔ لیکن اب اس مرض سے چکر لڑنا

اتنی ہی بڑی مصیبت بن گیا ہے۔ میرے مکرم استاد آقا بیدار خجست کتنا سچ کہا ہے
 ۵ الغرض اس جہان فانی میں موت ہے سہل۔ زندگی دشوار
 لیکن سناؤں بھی تو سنیگا کون۔ وہ دوست جنہیں اپنے کاموں سے ہفت روزہ فرصت نہیں
 کہ مجھ سے پوچھیں کہو کیسے گذرتی ہے۔ یا وہ امیر دوست جنہیں رات کے وقت یہ کہلا
 بھیجنے کی فرصت تو ہوتی ہے۔ کہ کل صبح ہمارا کوچ ہے۔ لیکن یہ خیال نہیں آتا
 کہ آپ بھی ہمارے ساتھ آئینگے۔ ہماری کار میں جگہ ہے۔ لیکن یہ توقع ہی کیوں
 یا میرے لوگ کسی غریب کے مداح ہو سکتے ہیں۔ دوست نہیں اور یوں بھی کوئی خواہ
 لکھتی ہو، اسکے پاس اتنی گنجائش کہاں۔ کہ کسی فضول کام کے لئے اپنے خزانہ
 پر بار ڈال سکے۔ ایسے موقعوں پر وہ خود مفلس ہوتا ہے۔ غالب تو خدا کو بھی
 کہہ گیا۔

یارب تو کجائی کہہ باز رہی بیدار خدائی کہہ باز رہی
 نے تے تو نہ غامی و نہ بے رحمی بے مایہ چو مائی کہہ باز رہی

بہر حال ان سے گلہ ہی کیا۔ بلکہ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اپنی اس فضول اور
 لا حاصل زندگی کا بوجھ اپنے قرابت داروں پر بھی کتنی ڈالے رکھوں۔ کوئی کام
 کرنا ہو تو میرے سامنے نام مرت لو۔ اور کھانا پینا ہر تو مجھے بہترین دور۔ یہ صورت حال
 خود مجھے پانی پانی کہہ رہی ہے۔ یوں زندگی کی دیگر لطافتوں سے بہرہ مند ہو
 جوگ بھی تو نہیں رہ گیا۔ کہاں وہ دن۔ کہ چاندنی راتوں میں رادی کے سینے پر ناؤ
 چلانا۔ اور کہاں اب کہ دوستوں کیساتھ پانی میں تیر بھی نہیں سکتے۔ وہ پہاڑیاں
 پھاندتے پھرتے ہیں اور سہل مسوس کہہ رہا ہے میں قدم قدم پر اس مرض کا

احساس بستر میں کانٹے کی طرح چھتا رہتا ہے۔ کہیں چھلانگ لگا ٹی نہیں کسی بے تکلف دوست سے چھینا چھٹی کرنے پر تلے نہیں کہ کوئی قریب ٹوک دیتا ہے بس پھر نہ پوچھیے کہ طبیعت کستور ریزا ہو جاتی ہے۔ ہر کوئی یہی کہتا ہے کہ ”آرام آرام۔“ اور بس آرام! لیکن وہ نہیں جانتے کہ اپنے قربت و دلول کا دست نگر ہو کر آرام کرنا کستور بے آرامی کا باعث ہوتا ہے خصوصاً مجھ ایسا حساس جو

تشنہ لب بر ساحل دریا ز غیرت جاں و ہم
گر بوج افتد گمان چہن پیشانی مرا !!!

کا قائل ہو۔ اب مزید اس صورت حال کو بدداشت نہ کر سکیگا پھر وہی عزم و مانع میں ہیجان پیدا کر رہا ہے۔ نہیں جانتا کہ عنقریب کیا ہو تیوالا ہے۔ کئی کئی باتیں ایک ساتھ و مانع میں گھوم رہی ہیں۔ جنگ فوج.... نہیں اتنی دیر نہیں تو پھر.... لیکن بنانے سے کیا حاصل۔ آپ لوگ عنقریب خود ہی سن لیگیے خیر الفت تو میں یہ ختم کر رہا ہوں۔ اور میرے ایک غوار سامنے بیٹھے کسی کا دیوان پڑھ رہے ہیں۔ اور مجھ سے اس شعر کی داوطلب کر رہے ہیں۔

اے مرگ ناگہاں تیری غیرت کو کیا ہوا
کیوں منتظر تیغ ستم کر رہا ہوں میں

منگلرگ۔ مئی ۱۹۴۱ء تالاہور فروری ۱۹۴۲ء

باہتمام سریندر ناتھ ساہنی ہڈنٹر پبلشرز ایم پرنٹنگ پریس جڈوں سے شائع ہوئی

